کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہ و صوفی و مُلّا کی ناخوش اندیشی
(اقبال)

مآلِ بصیرت

از

عطاء اللہ پالوی

گوہر دریائے قرآں سُفتہ ام
شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
(اقبال)

ناشرین
سنگم کتاب گھر اردو بازار۔ دہلی

فہرست

صفحہ

۱۔ پیش کتاب (مقدمہ) ——— ۵

۲۔ فدیہ ——— ۱۳

۳۔ حکمت ——— ۲۱

۴۔ اُمّی ——— ۴۱

۵۔ تزکیہ ——— ۶۰

۶۔ مقابلہ ——— ۷۹

۷۔ مسلمان ——— ۹۱

۸۔ آدم ——— ۱۰۲

۹۔ عید ——— ۱۲۳

۱۰۔ مشرک ——— ۱۳۵

۱۱۔ اجنبی ——— ۱۵۳

10009

پہلی بار ۱۰۰۰

قیمت دو روپے [illegible]

جولائی ۱۹۵۷ء

یونین پرنٹنگ پریس اردو بازار دہلی میں طبع ہوئی

پیش کتاب

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہی جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری (اقبال)

زیرِ نظر مجموعہ مضامین، مختلف عنوانات پر مختلف مضامین کا حامل ہے۔ اس کے مطالعہ کے وقت غالباً ہر بات آپ کے سامنے نئی شکل میں آئے گی اور آپ دیکھیں گے کہ وہ اُس سے قطعاً مختلف ہے اور ہو گی جو ہم اور آپ اُس کے بارے میں، اب تک سُنتے اور ہر کتاب میں پڑھتے آئے ہیں۔ از روئے قرآن "یہ طریقہ کافروں اور مُشرکوں کا رہا ہے کہ دین و ایمان اور عقیدہ و خیال کے بارے میں اپنا نظریہ و مسلک یہ رکھیں کہ :۔

وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا — "ہم نے اپنے آبا و اجداد کو اسی مسلک پر
وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ط (اعراف ۲) پایا ہے اور یہی اللہ کا حکم بھی ہے"

"قرآن" محمد الرسول اللہ کے آبا و اجداد کے عقیدہ و خیال کے خلاف تعلیمات کا حامل تھا۔ اور رسول اللہ کی سُنّت یہ ہے کہ اپنے بزرگوں اور اگلوں کے عقیدہ و خیال سے قطعاً کنارہ کش ہو کر "قرآن" اور صرف "قرآن" کی روشنی میں، غور و فکر اور مطالعہ و مشاہدہ کے بعد اپنا عقیدہ و

جو کچھ سمجھے ہوئے ہیں وہ کتنا غلط ہے۔ آپ اس پر اعتماد و یقین کیجئے کہ "اسلام" دنیا کا واحد عقلی اور تنہا فکری "دین" ہے۔ لہٰذا اس کا دستور العمل "قرآن" آپ کو از خود سمجھنا چاہیئے۔ پھر جب آپ "قرآن" کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کریں گے تو آپ ہدایت پالیں گے یعنی یہ جان اور سمجھ لیں گے کہ قرآن کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ اور "مسلمانوں" کا یہ "دستور العمل" آپ سے کس معاملے میں کیا کہتا اور کیا مطالبہ کرتا ہے؟

اسلام "مذہب" نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹے میں محض چند رسومات کی ادائیگی کا مطالبہ کر کے آپ کو باقی گھنٹوں میں شتر بے مہار بنا دیتا ہے اور جیسا کہ آج کل لوگ اسلام کو سمجھے ہوئے ہیں، بلکہ اسلام "دین" ہے۔ یعنی ایک قانون۔ ایک تصور حیات۔ ایک نظام زندگی۔ اس نظام زندگی کا مکمل اصولی دستور العمل "قرآن" ہے "قرآن" کا جو کچھ مطالبہ ہے وہ یہ کہ:۔

(۱) آمِنُوْا : = قرآن کی روشنی میں زندگی کا صحیح نصب العین متعین کر لو۔

(۲) اِعْمَلُوْا : = اس متعینہ صحیح نصب العین کے حصول کی ہر امکانی کوشش کرو۔

بس یہی اسلام ہے۔ یہی اسلام قرآن نے پیش کیا ہے۔ اسی اسلام کی رسول اللہ نے دعوت دی تھی اور اسی اسلام کو صحابہ کرام اور اہل بیت نے قبول کیا اور اپنایا تھا اور وہ فائز المرام ہوئے تھے۔

اسلام وہ منفرد تصور حیات اور مخصوص نظریۂ زندگی ہے جس میں تلاش و جستجو، کوشش و محنت، سعی و کاوش اور جہد و عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور اس

مسلک خود قائم و مستحکم کریں۔ اس کی جانب ذرا بھی توجہ نہ دیں کہ باپ دادوں کا کیا خیال اور نظریہ تھا؟ لہٰذا آپ بھی اس پر مطلقاً دھیان نہ دیجئے کہ ہمارے اگلوں اور بزرگوں نے "قرآن" کو، قرآنی الفاظ کو، اور قرآنی احکام و تعلیمات کو کیا اور کیسا سمجھا تھا؟ انھوں نے "قرآن" کو جو کچھ اور جیسا کچھ سمجھا تھا وہ سمجھا تھا اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ کیا تھا ہمیں بہ ادب آس سرمائے کو تہ کر کے بطور تبرک طاق پر دھر دینا چاہیئے۔ ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں ہونی چاہیئے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (بقرہ ۱۶)

"یہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ اُن کے سامنے آئے گا۔ اور تم لوگ جو کچھ کروگے وہ تمہارے سامنے آئے گا اور تم لوگوں سے اُن کے بارے میں ذرا بھی پوچھ تاچھ نہ ہوگی"

آپ ان صفحات کو غور سے پڑھیئے اور "قرآن" آپ کے گھر میں ضرور ہوگا، سمجھنے کے لئے نہ سہی، بے سمجھے "تلاوت" ہی کے لئے سہی "تلاوت" کے لئے نہ سہی "برکت" ہی کے لئے سہی۔ آپ اس کو نکالئے اور سامنے رکھکر، اپنی اُس عقل کی روشنی میں جو اللہ تعالےٰ نے آپ کو صرف اس لئے دی ہے کہ آپ اُس سے ہر معاملے میں کام لے سکیں، میری ان تحریروں کو جانچیئے اور پرکھئے۔ اگر وہ "غلط" ثابت ہوں تو انھیں ٹھکرا دیجئے اور مجھے بھی "قرآن" سے میری غلطی بتا اور سمجھا دیجئے اور اگر میری تحریریں آپ کو "صحیح" معلوم ہوں تو سوچئے کہ آپ "قرآن" سے کس قدر بے خبر ہیں؟ اور

مگر اور کچھ کرنے سے قبل ـــــ سب سے پہلے کیا کرنا ہوگا ؟۔
یہ مجھ سے نہیں بلکہ امریکہ کے ایک مشہور مفکر و جرنلسٹ رابرٹ ماؤنٹین
(Robbert Mountagn) سے سُنئے ۔ اُس نے امریکہ کے
مشہور سہ ماہی رسالہ (Foreign affairs) بابت
ماہ جولائی ۱۹۵۲ء میں، مسلمانوں کی "نشاۃ ثانیہ" سے متعلق ایک مقالہ لکھا
ہے ۔ اس مقالہ کا اختتام ، اس نامور مفکر نے اس صداقت بہ آغوش
سرمایۂ فکر اور حقیقت بدوش فیصلۂ ناطق پر کیا ہے :۔

"اگرچہ ایک عیسائی کو اس باب میں احتیاط سے لب کُشائی
کرنا چاہیئے ۔ لیکن اُسے یہ حق تو ضرور ہی حاصل ہے کہ وہ اپنے
اس عقیدے کا اظہار کر دے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے
لئے ضروری ہے کہ قرآنی اقدار کا از سرِ نو تعین کیا
جائے ۔ لیکن قرآنی اقدار کا از سرِ نو تعین اُس وقت
تک ناممکن ہے جب تک کہ "قرآن" کو "روایات"
کی گرفت سے آزاد نہ کرالیا جائے ـــ "قرآن" ایک
لعل گرانمایہ ہے مگر وہ "روایات" کی قدیم اور مبہم زبان
کے نیچے بُری طرح دب کر رہ گیا ہے ۔ اُسے ان مٹی
کے تودوں سے باہر نکالنا ہوگا ۔"

آپ اپنے اس "قرآن" کے بارے میں ایک مفکر کی اور رائے سن لیجئے ۔
ایچ ۔ جی ۔ ویلز وہ یوروپین مفکر ہے جس کے سرمایۂ فکر کا معاوضہ الفاظ گن کر

جہدِ عمل کی حدود "زمین" سے "آسمان" تک پھیلی ہوئی ہیں۔ شجر و حجر، دشت و جبل، صحرا و دریا اور آفتاب و ماہتاب، کچھ بھی باہر نہیں سب اس کی دسترس کے اندر ہیں:۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط (لقمٰن ۳)

"کیا تم کو یہ سجھائی نہیں دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب کے سب کو تمہارے لئے مسخّر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی وہ تمام نعمتیں پوری کر دی ہیں جو تم کو نظر آتی ہیں اور وہ بھی جو تم کو نظر نہیں آتیں؟"

مگر اس کے لئے "کچھ کرنا" بھی ہوگا۔ بے کچھ کئے یہ نعمتیں از خود گود میں ٹپک نہیں پڑیں گی

میری میں، فقیری میں، شاہی میں، غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا، بے جرأتِ رندانہ (اقبال)

بے جدوجہد، بلا کد و کاوش اور بغیر خونِ پسینہ ایک کے کبھی نہ کسی کو کچھ ملا ہے اور نہ آئندہ کبھی کچھ ملے گا۔

اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (نجم ۳)

"بلاشبہ انسان کو کچھ بھی نہیں ملے گا مگر ہاں اتنا ہی جتنا وہ محنت اور کوشش کرے گا اور بلاشبہ انسان کی سعی و کاوش ہی دیکھی جائے گی پھر اسی کے مطابق اس کی پوری پوری اجرت دی جائے گی!"

اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آجائے ؟ نوع انسانی خشک
نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ
اس بطل جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام
نوع انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔"

اب آپ خود فیصلہ کیجئے کہ بقول حضرت اقبال :۔

وہ چنگاری خس و خاشاک میں کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا؟

عطاء اللہ بالوی

اور فی لفظ شرح معاوضہ طے کر کے معاوضہ ادا کیا جاتا ہے ۔ یہ مفکر لکھتا ہے :-

"بلاشبہ یہ درست ہے کہ مسلم قوم راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے۔ مگر اس راکھ کے ڈھیر میں، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ایک چنگاری بدستور روشن اور زندہ موجود ہے جسے "قرآن" کہا جاتا ہے ۔ اگر کسی ہوا نے اس پر سے یہ راکھ ہٹا دی تو اس مرتبہ اس کی آگ بھڑک کر ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی "

اس "چنگاری" پر "راکھ کا ڈھیر" کیا ہے ؟ یہ آپ "رابرٹ ماؤنٹین" سے سن چکے ۔ اب یہ آپ کی خوشی و خواہش، آپ کی تمنا و مرضی اور آپ کی حمیت و غیرت پر منحصر ہے کہ اس "راکھ" کو عزیز رکھتے ہوئے اس زندہ "چنگاری" کو بدستور راکھ میں دبی رہنے دیں یا پھر راکھ کو ہٹا کر اس روشن اخگر کو نکالیں تاکہ وہ پھر وہ کچھ کر دکھائے ۔ جو اس نے کبھی پہلے کر دکھایا تھا اور جس کا "حیات محمد" میں کارلائل (Carlyle) نے یوں نقشہ کھینچا ہے ۔

وہ عرب ! ـــــ یہ محمد !! ـــــ اور صرف ایک سو سال کا عرصہ !!! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتشگیر مادے میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک

"فدیہ"

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف (اقبال)

"اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ "قرآن" کو اس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام پردے ہٹائیں، جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی مؤثرات نے اُس کے چہرے پہ ڈال دیئے ہیں، پھر آگے بڑھیں اور "قرآن" کی حقیقت خود "قرآن" ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔" (علامہ ابوالکلام آزاد۔ ترجمان القرآن جلد اول)

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب پیری چھا گئی اور اس کے بعد بھی اُن کے کوئی بچہ نہ ہوا تو آخر انھوں نے دست سوال دراز کیا[1]:۔

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ "اے میرے رب مجھ کو ایک صالح فرزند عطا فرما"

بھلا ابراہیم کچھ کہیں اور مانا نہ جائے؟ فوراً ہی دریائے رحمت جوش میں آگیا:۔

---

[1] یہ پورا واقعہ سورۂ والصّٰفّٰت (پارہ ۲۳) میں درج ہے۔

صاحب نے فرمایا :۔

"اور اس کا بدلہ دیا ہم نے ایک جانور ذبح کو بڑا۔"

علامہ اشرف علی صاحب نے فرمایا :۔

"اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اُن کے عوض میں دیا۔"

اس طور پر وہ "مینڈھا" بڑھ گیا اسمٰعیلؑ سے یعنی حضرت اسمٰعیلؑ تو "معمولی ذبیحہ" ہو کر رہ گئے اور مینڈھا "ذبح عظیم" ہو گیا یعنی ایک حقیر جانور، ایک اشرف المخلوقات انسان اور ایک پیغمبر و پیغمبر زادے سے بھی بڑا، مقدس اور اہم ہو گیا۔ حالانکہ یہ ترجمہ اور مفہوم یوں بھی مہمل ہے۔ کیونکہ "بدلہ" اسی وقت دیا جاتا ہے جب کوئی چیز کسی سے لے لی جائے۔ جب حضرت اسمٰعیل ذبح ہی نہ ہوئے اور پھر حضرت ابراہیمؑ کو وہ مل ہی گئے تو پھر "بدلہ" کیا اور کس بات کا؟ بدلہ تو جب دیا جاتا جب حضرت اسمٰعیلؑ ذبح ہو جاتے۔

علامہ سید سلیمان ندوی بات کی تہ کو ایک حد تک پہنچے ہیں[1]

(۱) "اب سوال یہ ہے کہ وہ "بڑی قربانی" کیا تھی؟ جس کو حضرت اسمٰعیل کی اس قربانی کا فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا؟ مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لا کر حضرت ابراہیم کے سامنے کر دیا گیا کہ وہ حضرت اسمٰعیل کی جگہ قربانی کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم نے ایسا ہی کیا اور اس مینڈھے کی حضرت اسمٰعیل کی جگہ قربانی کی۔ مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ

---

[1] مضامین سید سلیمان ندوی حصہ اوّل

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ○ "سو اس کو بشارت دی گئی ایک حلیم لڑکے کی"

مگر مشیت میں تو ایک بڑا پروگرام بنا ہوا تھا جب حضرت اسمٰعیلؑ جوان ہوئے تو حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں۔ فوراً بیٹے سے خواب کی خبر دے کر مشورہ کیا اور جب سعادتمند بیٹے نے اپنی رضامندی ظاہر کی تو حضرت ابراہیم نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا کہ ذبح کر دیں تو یکایک ان کو روک دیا گیا کہا گیا کہ کیا واقعی خواب کو تم نے سچ ہی کر دکھایا؟

اس کے بعد ہے:-

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ "اور اس کو بدلہ دیا ذبح عظیم کا"

یہ آیت ہزاروں برس سے چیستان بنی ہوئی ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ "فدیہ" کیا دیا گیا؟ چونکہ توریت میں درج تھا کہ:-

"تب ابرہام نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں۔ تب ابرہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا اور اس کو اپنے بیٹے کے بدلہ میں سوختنی قربانی کے لئے چڑھایا۔"

(کتاب پیدائش ۱۳ - ۲۲)

اس لئے روایت کے ذریعے یہ چیز اسلام میں بھی داخل ہو کر قرآن پر حاوی ہو گئی اور مذکورہ بالا آیت کو اسی روایت پر ڈھالنے کی اس طرح رسم جاری ہو گئی کہ قرآنی آیت کا ترجمہ تک اسی طرح کیا جانے لگا۔ علامہ عبدالقادر

چھوڑا، وہاں کے عیش و آرام کو خیرباد کہا۔ عزیز و اقارب کو ترک کیا اور ایک لق و دق صحرا میں رہنا گوارا کیا۔ وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا اور اس کو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لئے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا اور اس طرح دین حق کی تبلیغ اور خانۂ خدا کی پاسبانی کے لئے اپنی پوری نسل کو ایسے صحرائے بے آب و دانہ میں گذار دینے کا حکم دیا۔ یہ بھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسمٰعیل کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیم کو دکھائی گئی"!

مگر جہاں تک کہ "فدیہ" کا تعلق ہے علامہ موصوف بھی اس گتھی کو نہ سلجھا سکے آپ فرماتے ہیں :-

"وہ ذبح عظیم کا فدیہ جس کے بدلے میں حضرت اسمٰعیل کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، اُن کی وہ روحانی قربانی ہے جو نسلاً بعد نسلاً اُن پر فرض ہوئی"۔

آپ نے گویا "فدیہ" ابراہیم کے بجائے اسمٰعیل پر چسپاں کر دیا۔ چنانچہ آیت مذکور کا ترجمہ بھی یوں کیا ہے :-

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصّٰفّٰت ۳) "اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا"۔

کس قدر مہمل بات ہوگئی؟ کون چیز اسمٰعیل سے لی گئی جو ان کو "فدیہ" دیا گیا؟ اور اللہ نے کیا بڑی قربانی دے کر کیا چھڑایا؟ سیدھی سادی بات

نہیں اور ان سب کا ماخذ توراۃ ہے "

(۲) "درحقیقت اللہ تعالےٰ نے حضرت ابراہیم کو جو خواب دکھایا تھا وہ "تمثیلی" تھا۔ یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کی قربانی کر رہے ہیں، کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کو ہمیشہ کے لئے خدا کی راہ میں "خانۂ کعبہ" کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کے لئے خدا کی راہ میں قربان کردیں۔ حضرت ابراہیم نے فداکاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا اور چلے اپنے اکلوتے بیٹے کی خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے۔ مکہ کے پاس پہنچ کر بیٹے کو قربان گاہ پر چڑھا کر چاہا ہی تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دیں کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیم کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب "حقیقی" نہیں "تمثیلی" تھا اور حضرت اسمٰعیل کی "جسمانی قربانی" نہیں بلکہ "روحانی قربانی" مقصود ہے "

(۳) "روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً "ذبح عظیم" ہے۔ جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے جس میں "مر" کر نہیں بلکہ "جی" کر حق کی راہ میں ہر تکلیف اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لئے آمادہ رہنا ہے "

(۴) حضرت اسمٰعیل نے اس کی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو

بھی دیا :-

وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ "اور اس کو بدلہ دیا ذبح عظیم کا"

کیا بدلہ دیا سنئے :-

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ "اور اس کو بشارت دی گئی اسحٰق کی کہ وہ نبی ہوگا، صالحین میں سے ہوگا"

ابتدا میں حضرت ابراہیم کی دعا تھی کہ :-

رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ "مجھ کو صالحین میں سے، اے پروردگار ایک دے"

اس کا جو جواب ملا تھا اس میں صرف اتنا تھا کہ :-

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ "سو اُس کو بشارت دی گئی کہ ایک حلیم لڑکا ہوگا"

نہ یہ ذکر کہ وہ صالحین میں سے ہوگا نہ یہ کہ وہ نبی ہوگا* مگر اس وقت جب کہ اللہ نے ایک بڑی قربانی لے کر ابراہیم کے بھرے گھر کو ویران کر کے "ذبح عظیم" کا مطالبہ کیا تھا۔ تو اس کی آمادگی پر بہت کچھ بلکہ سب کچھ فوراً بتا دیا گیا۔ ابراہیم کو بدلہ میں ایک دوسرا بیٹا دیا گیا اور چونکہ یہ بڑا نازک موقع تھا اس لئے حضرت ابراہیم کے پورے اطمینان اور تشفی کے لئے سب بیک زبان بتا دیا گیا کہ تم کو دوسرا بیٹا دیا جائے گا جس کا نام اسحٰق ہوگا جو نبی ہوگا جو صالحین میں سے ہوگا۔ یہ تھا "بدلہ" اور "فدیہ" اس "ذبح عظیم" کا۔ کہ جس کا اللہ نے ابراہیم سے مطالبہ کیا اور ابراہیم نے دیا۔ بیٹے کے عوض بیٹا۔ نبی کے بدلے نبی۔ صالح کی جگہ پر صالح۔ اگر اللہ نے اپنے گھر کے رونق کا ابراہیم سے اسمٰعیل کو لے کر انتظام کیا تو ابراہیم کا

* کیونکہ اس لڑکے کو وارث ابراہیم تو ہونا نہیں تھا بلکہ کعبہ کا خادم بننا تھا۔

ہے مگر سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔

حضرت ابراہیم ملک شام کے حاکم تھے۔ حضرت اسمٰعیل اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ گھر کی رونق تھے۔ تخت شام کے وارث تھے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت اسمٰعیل کو خانہ کعبہ کی مجاوری دی جائے۔ اللہ اپنے محبوب بندے ابراہیم کی اس اکلوتی اولاد کو اپنے گھر کی تولیت سپرد کرے۔ اس طور پر حضرت ابراہیم کا اس قدر عزیز بیٹا جیتے جی باپ سے جُدا ہو جاتا تھا۔ یہ کام اللہ ابراہیم سے لینا چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو خود خدا کے حوالہ کر دیں۔ اسی مشیت کو حضرت ابراہیم نے خواب میں یوں دیکھا کہ اپنے ہی ہاتھ سے اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں اور جب اس مشیت پر حضرت ابراہیم نے لبیک کہکر، اسمٰعیل کو لٹا کر چھری تیز تیز ثبت کر دینی چاہی تو اُن کو روک کر بتا دیا گیا کہ اللہ کیا چاہتا ہے؟ ذبح ہونے کی صورت میں چند منٹ تڑپ کر اسمٰعیل ٹھنڈے ہو جاتے دو چار چھ ماہ میں ابراہیم کو بھی صبر آجاتا۔ لیکن یہ جیتے جی گھر کی رونق، آنکھوں کی ٹھنڈک اور تخت کے وارث کو، کعبہ کی مجاوری کے لئے وقف کر کے اللہ کو دیدینا، بڑا صبر آزما تھا۔ ایثار و قربانی کا عجیب و غریب مظاہرہ تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو "ذبح عظیم" کہا۔ اور جب حضرت ابراہیم اس "ذبح عظیم" کے لئے بھی آمادہ ہو گئے تو ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس کا عوض اور بدلہ (فدیہ) ملنا ضرور تھا۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے یہ زبردستی نہ کی کہ ابراہیم سے اُن کے بڑھاپے کے اس سہارے کو یوں ہی لے لیا۔ بلکہ اس کا بدلہ

"حکمت"

بیا، کہ غلغلہ در شہر دلبراں فگنیم
جنونِ زندہ دلاں، ہرزہ گردِ صحرائیست (اقبال)

شہر مکہ میں خدا کے دو برگزیدہ و مخلص مزدور، خدا کے گھر کی دیواریں اٹھاتے ہیں اور دونوں باپ بیٹے، اس محنت کی مزدوری، اپنے مالک سے مشفقہ طور پر یوں طلب کرتے ہیں :-

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (بقرہ ۱۵)

"اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں، ان ہی میں سے، ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو ان لوگوں کو تیری آیتیں پڑھ پڑھ کر سنائے والا اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والا اور ان کا تزکیہ کرنے والا ہو۔ بیشک تو بڑا غالب اور حکمت والا ہے"

چار مقدس و محترم اور نرم و نازک لبوں سے نکلتے ہی یہ دعا موج گل بن کر، چاروں طرف سے فضائے مکہ کو معطر و معنبر بنا دیتی ہے اور پھر برابر بنائے ہی رکھتی ہے۔ ان حسین و متین آوازوں کے بلند ہوتے ہی ابر کرم

گھر بھی بے چراغ نہ رہنے دیا۔ اگر اپنی ایک نئی حکومت کی داغ بیل ڈالی تو ابراہیم کو بھی وارث تخت و تاج دیا۔ پورا پورا بدلہ جنچا تلا عوض۔ تاکہ ابراہیم بھی خوش رہیں اور اللہ کی مشیت بھی پوری ہو۔ سیدھی سادی سی بات ہے۔ مگر "توراۃ" کے اثر اور "روایت" کے جادو نے اس مختصر سی آیت کو چیستاں بنا دیا ہے۔ وہ وہ تاویلیں کی گئی ہیں اور ہو رہی ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہوتیں حقیقت یہ ہے کہ اگر ادھر اُدھر سے "قرآن" سمجھا جائے گا تو عمر بھر سمجھ میں نہ آئے گا۔ "قرآن" کو بس "قرآن" ہی سے ٹھیک سمجھا جا سکتا ہے۔

جبّہ میں موجِ نسیم، شگفتگی میں گلِ رعنا، گفتگو میں ہزار داستاں، لطافت طبع میں چاندنی، بے تعصبی میں آفتاب، علم میں سمندر اور معتقدات میں قوس قزح واقع ہوئے ہیں، مجھے ازراہ محبت و دوستی، راہ راست پر لانے کے لئے میرے ایک دوست کے یہاں کی منعقدہ مجلس کے موقع پر یہ سمجھانے اور بتانے کی کوشش کی تھی کہ اس آیت میں "کتاب" سے مراد "قرآن" اور "حکمت" سے مراد "حدیث"[1] ہے مگر میری کوتاہ نصیبی کے سبب، اُن کی مخلصانہ کوشش کے باوجود، ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہ آنی تھی نہ آئی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اگر "حکمت" سے مراد "حدیث" ہے تو پھر کتاب سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ "قرآن" کے لئے تو پہلے ہی "یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ" ہو ہی چکا؟ اور اگر "کتاب" سے مراد "قرآن" ہے تو پھر "یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ" کیا چیز ہے؟

میرے نزدیک "کتاب" اور "حکمت" (یعنی کتابی علوم و فنون اور اُن کے سارے نکتے اور اشارے) سب اُسی "قرآن" کی صفت اور اُسی "قرآن" کے اندر ہیں جس کے لئے یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ آیا ہے۔ جس حد تک کہ "قرآن" کے الفاظ کا تعلق ہے اس کے لئے "تلاوت" کا

---

[1] یہ وہ پامال خیال ہے جسے امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ/۸۲۲ء) کے عہد سے اس وقت تک تمام حدیث پرست پیش کرتے آئے ہیں۔ امام شافعی نے اپنی کتاب "الام" کی ساتویں جلد میں بھی فرمایا ہے کہ "حکمت" سے مراد "حدیث" ہے اور وہیں سے یہ دلیل اب تک متوارث چلی آتی ہے۔

جھوم کر اُٹھتا اور ارض کعبہ کو گھیر لیتا ہے اور پھر ہمیشہ گھیرے ہی رہتا ہے۔ اِس اُجرت طلبی کے لئے دستِ سوال اٹھتے ہی۔ اس مبارک شہر کی پتھریلی زمین پر چھما چھم اور جھما جھم، بارشِ رحمت شروع ہو جاتی ہے اور پھر مسلسل ہوتی ہی رہتی ہے۔ تا آنکہ تقریباً تین ہزار برس کے بعد ایک دن ۲۰ر اپریل ۵۷۱ء کی صبح کو خلیل و ذبیح کی یہ "دعا" پہلوئے آمنہ میں بجنسہٖ مجسم و مشکل جلوہ فرما نظر آتی ہے اور پچاس سال کے بعد وحی الٰہی، اہل مکہ پر احسان جتاتی ہے کہ:۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (جمعہ ۱)

"وہ ایسا ہے جس نے اُمّیین میں، اُن ہی میں سے، ایک ایسا رسول مبعوث کیا ہے جو اُن کو، اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح بے خبری میں تھے۔

اس آیت میں حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام کی دعاء کے عین مطابق، اُن ہی لفظوں کے ساتھ، رسول کریم کی چند خصوصیتیں ظاہر کی گئی ہیں یعنی یہ کہ، یہ وہ رسول ہے جو "قرآن" پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سناتا ہے اور یہ کہ وہ لوگوں کا "تزکیہ" کرتا ہے اور یہ کہ وہ لوگوں کو "کتاب و حکمت" کی تعلیم دیتا ہے۔

ایک مرتبہ، میرے ایک بہت ہی مخلص دوست نے، جو قدیم سرو

اور ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس آیت جلیلہ میں "حکمت" کا لفظ "حدیث" کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ اس سے مراد خود قرآن ہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں ہے :۔

(۱) وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ (ص ۲۰) "ہم نے اس کو حکمت دی تھی"

(۲) وَاٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ ۲۵۱) "اور اللہ نے اس کو حکومت اور حکمت عطا فرمائی تھی"

ظاہر ہے کہ حضرت داؤدؑ کو بجز ایک آسمانی کتاب یعنی کتاب اللہ" کے دوسری کوئی کتاب یا حدیث نہ ملی تھی جس کو "حکمت" سے تعبیر کیا گیا؟ اسی طرح بجز "انجیل" کے کوئی دوسری حکمت والی کتاب تو نازل نہ ہوئی تھی مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں ہے کہ :۔

(۱) عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (مائدہ ۱۵) "میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت دی"

(۲) قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (زخرف ۶۳) "میں تمہارے پاس حکمت لیکر آیا ہوں"

ان چاروں آیتوں کو علامہ سید سلیمان ندوی، جو حدیث پرست ہیں سیرۃ النبی جلد سوم صفحہ ۱۲۰ میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"پہلی اور دوسری آیت میں "حکمت" کا اطلاق "زبور" پر اور تیسری اور چوتھی آیت میں "انجیل" پر ہوا ہے۔ کہ اُن میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے

لفظ آیا ہے اور جس حد تک کہ قرآن سے مترتب ہونے والی افادیت کا سروکار ہے، اُس کے لئے "تعلیم" کا لفظ آیا ہے۔ اسی لئے "قرآن" کی "تلاوت" کا بھی حکم ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (بقرہ ۱۲)

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اُس کی تلاوت کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے تو یہی وہ ہیں جو اس پر ایمان لاتے ہیں"

اور قرآن میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کا بھی:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ؕ (محمد ۳)

"کیا لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ کیا اُن کے قلوب پر تالے لگ گئے ہیں"

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ (ص ۳)

"یہ مبارک کتاب ہم نے تم پر اس لئے نازل کی ہے کہ لوگ اسکی آیات پر تدبر و تفکر کریں"

رسول کو جو حکم ہوا تھا اس میں دونوں چیزیں شامل تھیں:-

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ۝ (نحل ۶)

اور ہم نے تم پر یہ قرآن نازل کیا ہے۔ تاکہ جو تم پر نازل کیا گیا ہے اُس کو لوگوں سے بیان کر دو اور تاکہ وہ لوگ اس میں غور و فکر کریں"

لہٰذا "تلاوت" کا تعلق "قرآن" کے الفاظ سے ہے اور "تعلیم" کا سروکار "کتاب و حکمت" یعنی "علوم و فنون" کے اُن اسرار و رموز سے ہے جو قرآنی آیات میں مستور و موجود ہیں اور جو غور و فکر ہی سے حاصل ہوتے

ظاہر ہے کہ "نزول" کا اطلاق سوائے "قرآن" کے دوسری کتاب پر نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا۔ ازواج مطہرات کو مخاطب کرکے حکم ہوتا ہے وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ (احزاب ۳۴) یعنی "اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت، تلاوت ہوتی ہیں ان کو یاد رکھو"۔ ظاہر ہے کہ "تلاوت" کا اطلاق سوائے "قرآن" کے کسی دوسری کتاب پر نہیں ہوتا اور نہیں ہوسکتا۔ آنحضرت صلعم کو حکم ہوتا ہے کہ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (نحل ۱۶) یعنی "تم اپنے رب کی طرف، لوگوں کو حکمت کے ذریعہ بلاؤ"۔ اسی کو دوسری جگہ یوں کہا گیا فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ (ق ۴۵) سو قرآن کے ذریعے تم لوگوں کو سمجھاؤ"۔

بہرکیف! "حکمت" "حدیث" کو نہیں کہتے بلکہ "حکمت" قرآن کے اندر ہے اور "حکمت" میں وہ سارے قدیم و جدید کتابی علوم و فنون اور اُن کے نکتے اور اشارے داخل و شامل ہیں جو اب تک عالم وجود میں آچکے ہیں یا آئندہ آئیں گے اور اسی لئے ساتویں صدی ہجری میں امام رازی نے اور چودھویں صدی ہجری میں علامہ طنطاوی نے جو ضخیم تفسیریں لکھیں اُن میں اپنے اپنے عہد کے تمام علوم و فنون کی نشان دہی کرتے ہوئے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ دنیا کے سارے مفید علوم و فنون حاصل کریں مگر جہاں "قرآن" کو محض روزہ نماز کی کتاب سمجھ کے اس کو تبرک بنا دیا گیا ہو۔ اور جب لوگوں کا یہ عقیدہ ہو کہ "قرآن" کو بے سمجھے پڑھنا چاہیئے تاکہ

اور خود "قرآن پاک" نے بھی اپنی صفت "حکمت والا قرآن" ظاہر کی ہے تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ (لقمٰن و یونس)
وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ (یٰسین) وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ (آل عمران ۶)
ان آیتوں سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ "حکمت" کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحیٔ الٰہی خود اپنے اندر شامل کرکے اُن کو آپ مقطر بنا دیتی ہے۔ یہ چیز انبیاء کو عام طور سے ملتی ہے۔ فرمایا وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران ۹)
اور یاد کرو جب خدا نے نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب و حکمت دوں"۔

بھلا یہ "کتاب و حکمت" سب نبیوں کو ملتی رہی ہے تو یہ کہنا کہ "حکمت" سے مراد "حدیث" ہے، کس قدر سادہ لوحی ہے؟ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (بنی اسرائیل ۴)
یعنی "یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے"۔
اب اس سے بڑا ثبوت اس امر کا اور کیا چاہیئے کہ "حکمت" سے مراد "حدیث" نہیں ہے؟ مسلمانوں کو مخاطب کرکے ارشاد ہوتا ہے کہ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ (بقرہ ۲۹) یعنی "اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت نازل کی ہے"۔ دوسری جگہ ہے اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (نساء ۱۷) یعنی "اللہ نے تجھ پر کتاب و حکمت نازل کی"

فرمایا کرتے تھے کہ :۔

"جب تمہیں حصولِ علم کی ضرورت پیش آئے تو قرآن پڑھو کہ اُس میں اولین و آخرین کا علم موجود ہے"

قرآن کے سارے علوم و فنون کا منبع و مخزن ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا چاہیئے کہ وہ سارے علوم جن کو قرآن فہمی کے لئے حاصل کرنا "ملا" ضروری بتاتے ہیں نیز صرف و نحو کے سارے قاعدے خود قرآن ہی سے نکلے ہیں[1]۔ مارگولیتھ Margoliouth اعیسائی ہے۔ مگر آنحضرت صلعم کی سوانح عمری میں سربسجود ہے کہ :۔

"تحقیق جدید نے ہمیں اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ یورپ کے علما رنشاۃ ثانیہ سے پہلے یونانی فلسفہ، ریاضی، فلکیات اور دیگر علوم کے متعلق جو کچھ بھی جانتے تھے، ان کا منبع لاطینی کتابیں تھیں اور اُن کا سرچشمہ عربی علوم تھے اور جس قوت نے عربوں کے دل میں ان علوم کا شوق پیدا کیا وہ "قرآن" تھا"

یہی وجہ ہے کہ خدا اور اس کی نازل کردہ کتاب نے اپنے آپ کو "حکیم" کہا ہے "حکیم" کے معنی ہمارے یہاں کے "عربی تعلیم یافتہ" نہیں بلکہ "علوم و فنون کے ماہرین" ہیں۔ بقول علامہ جمال الدین افغانی :۔

---

[1] سارے علوم صرف و نحو، لغت، معانی، بیان، بدیع وغیرہ دوسری بلکہ تیسری صدی ہجری میں نکلے اور رائج ہوئے ہیں اور سب کے سب قرآن ہی سے نکلے ہیں ۱۲

ثواب ہو اور "قرآن" سمجھنے کی کوشش گمراہی ہے اور جب یہ خیال ہو کہ "قرآن" کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا تو پھر یہ تفسیریں کب مقبول ہو سکتی ہیں ؟ حالانکہ اگر "قرآن" محض روزہ نماز کی کتاب ہے تو یہ کس قدر حیرتناک بات ہے کہ "قرآن" کی کوئی بڑی یا چھوٹی سورۃ۔ مسجد۔ مصلی۔ وضو۔ تیمم یا روزہ وغیرہ سے منسوب و معنون نہیں مگر علوم و فنون کے موضوعات سے متعدد سورتیں منسوب و معنون ہیں اور اُن کا عنوان قطعی علمی و فنی ہے۔ مثلاً سورہ نحل یعنی (چیونٹی) سورہ نحل (شہد کی مکھی) سورۃ عنکبوت (مکڑی) سورہ صافات (اڑتے ہوئے پرندے) سورۃ انعام (چلتے ہوئے جانور) سورۃ شمس (سورج) سورۃ قمر (چاند) سورۃ نجم (ستارہ) سورہ بروج (ستاروں کی گذرگاہیں) سورۃ دخان (گیس۔ اسٹیم۔ بھاپ) سورہ حدید (لوہا۔ فولاد) وغیرہ وغیرہ۔ پورے "قرآن" کو چھان ماریئے کہیں پر بھی اللہ تعالےٰ نے مسجد۔ جائے نماز۔ سجدہ گاہ، نماز، روزہ۔ وضو۔ تیمم۔ ٹوپی۔ عمامہ وغیرہ کی قسم نہیں کھائی ہے مگر علمی عنوانات مثلاً رات، دن، فجر، روشنی، تاریکی، انجیر، زیتون، پہاڑوں، گھوڑوں، آسمانوں، برجوں، ستاروں اور ہواؤں وغیرہ کی اللہ تعالےٰ نے جا بجا قسم کھائی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی سمجھا جائے کہ قرآن علوم و فنون کا منبع و مخزن نہیں ؟ قرآن کے علوم و فنون کا مخزن و منبع اور ماخذ و سرچشمہ ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے خود دوات قلم اور اُس سے لکھی ہوئی تحریروں کی قسم کھائی ہے۔ تذکرۃ الحفاظ جلد اول صفحہ ۱۴ میں ابی اسحٰق۔ مرہ سے اور مرہ عبداللہ سے روایت کئے ہیں کہ آپ

اور قرآن دعوت دے رہا ہے کہ :-

(۱) اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (لقمٰن ۳) "کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے۔"

(۲) وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ط (رعد ۱) "اور سورج اور چاند کو بھی مسخر کر دیا ہے اور وہ ایک مستقر کی طرف چلتے ہی رہتے ہیں۔"

مگر بھلا مسلمان کا ہے کو "دنیا" کے چکر میں پڑیں وہ تو بس "دین" بنانے میں منہمک ہیں - ہمارے یہاں "قرآن" سمجھنے تک کی چیز نہیں پھر اس پر غور و فکر تو بڑی بات ہے۔ اصل یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں ابھی تک "خواندگی" (Literacy) اور "تعلیم" (Education) میں فرق ہی نہیں کیا گیا ہے۔ ہمارے یہاں "خواندگی" ہی کو "تعلیم" سمجھا جاتا ہے - بلاشبہ "تعلیم" کے لئے "خواندگی" ضروری ہے - مگر "خواندگی" ہرگز "تعلیم" نہیں ہو سکتی "زندگی" ہمیشہ "اقدار" (Values) کے تابع چلتی ہے اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں - جس قسم کی اقدار، انسان کے سامنے ہوں گی - اسی قسم کی زندگی ہوگی اور جس قدر اُن اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذب و انہماک سے، اُن کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرم عمل رہے گا "تعلیم" زندگی کے اقدار متعین کرتی ہے - جس قسم کی تعلیم ہوگی - اُسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی - صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار

"عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے علمار صدری اور شمس بازغہ پڑھ کر اپنے آپ کو فخریہ طور پر "حکیم" کہتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ وہ اپنے سیدھے اور بائیں ہاتھ میں بھی تمیز نہیں کر سکتے اور نہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟ ہم کو کیا ہونا چاہیئے اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ عجیب تر بات ہے کہ یہ لوگ اپنے سامنے لیمپ رکھ کر اول شب سے لے کر صبح تک شمس بازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ بھی غور نہیں کرتے کہ لیمپ کی چمنی نکال لی جائے تو وہ دھواں کیوں دیتا ہے؟ اور اگر چمنی رکھ دی جائے تو وہ دھواں کیوں نہیں دیتا؟ پتھر پڑیں ایسے "حکیم" پر اور ایسی "حکمت" پر۔"

(مضامین افغانی صفحہ ۱۰۲)

اس کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں رویت ہلال کا مسئلہ آج تک طے نہ ہو سکا ہے۔ یعنی ہنوز مسلمانوں کے "حکیم" یہ بھی طے نہ کر سکے ہیں کہ "چاند" کے متعلق کیا ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں کو کم از کم عید کے دن تو وقت پر یہ اطلاع مل جائے کہ چاند نکلا یا نہیں؟ برخلاف اس کے عیسائیوں کے "حکیم" چاند پر قبضہ کر لینے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ حالانکہ سورہ قمر انجیل میں نہیں قرآن میں ہے اور مسلمان قائل ہیں کہ عیسیٰؑ نہیں بلکہ محمدؐ نظام شمسی سے گذر کر معراج میں گئے تھے اور پھر لوٹ آئے تھے۔ اقبال للکار رہا ہے کہ:۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کے زد میں ہے گردوں

سب کچھ پہلے ہی سے موجود ہے۔"

بریفولٹ اپنی کتاب "تکمیل انسانیت" میں لکھتا ہے :-

"مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ امر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصر حاضر کی عظمت و حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے یعنی "علم الاشیاء" سائنس کی رُوح ! ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہین منت نہیں کہ انھوں نے ہمیں عجیب و غریب نظریات و انکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں۔ بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی اُن کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دُنیا درحقیقت زمانہ قبل از سائنس (Pre - Scientific) تھا۔ پندرھویں صدی تک یورپ اُن ہی علوم و فنون کو اپنا تا رہا جو اُسے مسلمانوں نے دیئے تھے اور اُس پر کوئی اضافہ نہ کر سکا۔"

یہ ہیں بریفولٹ (Briffault) کے تاثرات اُس دور کے بارے میں جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک وجدانی کیفیت سے جھومتا ہے اور "تشکیل انسانیت" "Making of Humanity" کے اس باب کو ایک دالہانہ انداز میں "دارالحکمت" کہکر متعارف کراتا ہے۔ اس کو اصرار ہے کہ یورپ نے "حکمت" صرف مسلمانوں سے سیکھی ہے :-

الائی جائیں ۔ رسول اللہ صلعم کے متعلق جب یہ فرمایا کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

تو اس سے مراد محض نوشت وخواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہ اعلیٰ علمی وفنی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی ہوتا ہے ۔ رسول اللہ پر جو قرآن نازل ہوا وہ زندگی کی صحیح اقدار انسانوں کے سامنے لاتا ہے ۔ اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں اور چونکہ قرآن ، وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری نشوونما ہوجاتی ہے ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ عملی طور پر بھی اس کا نمونہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے ۔ اسی لئے اس کام کے لئے رسول کا انتخاب ہوا اور قرآن نے اُن کی یہ تعریف کی اور اسی لئے رسول اللہ نے ہمیشہ قرآن ہی کی تعلیم دی ۔ برابر اسی کو پڑھنے اور اس پر غور وفکر کرنے کی تاکید کی ۔ اسی لئے ٹھیر ٹھیر کے پڑھنے کو کہا تاکہ اس کے مکتے سامنے آئیں ۔ اسی لئے یاد کرنے کو کہا تاکہ دماغ اس سے ٹکراتا رہے ۔ لہٰذا "حکمت" سے مراد "حدیث" نہیں ۔ حکمت خود "قرآن" ہے ۔ حکمت "قرآن" ہی کے اندر ہے ۔ علم وحکمت کا کوئی نکتہ ایسا نہیں جس کا آخری سرا "قرآن" سے نہ ملتا ہو ۔ جب ہی تو الکس لازوال "سیرۃ محمدی" میں اعتراف کرتا ہے کہ :-

"ہم عیسائیوں نے عیسائیت کو علم وحکمت سے ہم آہنگ وہمنشیں بنانے میں آج تک جتنی کوششیں کیں قرآن میں

اور پھر زمین مردہ کو حیاتِ نو بخشتے ہیں۔ اس خاک تفتہ سے سبزۂ نورستہ اُگتا ہے۔ اور کھجوروں کے فلک بوس درخت خوشوں سے لدے ہُوئے جھومتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ معجزات و آیات خداوندی نہیں؟ اور تمہارے مویشی؟ اللہ نے انھیں تمہاری خدمت گذاری کے لئے پیدا کیا۔ دیکھو کہ گھاس ان کے اندر پہنچ کر کس طرح دودھ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ ان ہی سے تم اپنے ملبوسات تیار کرتے ہو۔ کیسی فرماں بردار مخلوق ہے جو سرِشام سر جھکائے تمہارے مکانوں کی طرف خود بخود آجاتے ہیں؟ تم معجزات دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم خود معجزہ نہیں ہو؟ ذرا ان جوابات پر غور کرو کیا غیر ملوّث فکر اور حقیقت اشیا پر کیسی گہری نظر ہے؟ اس ذات گرامی میں خود دار صداقت کی والہانہ نظافت صاف جھلکتی نظر آتی ہے ایک ایسی پرزور ذہانت جو کسی معلم کی رہین منت نہیں۔ نگاہوں میں بصیرت قلب میں گہرائی ایک پُرشکوہ فرزند حوا ایسا انسان جس قسم کا بطل جلیل چاہے بن سکتا ہے۔ شاعر، سلطان، یا مبلغ وہ انسان جس کی نگاہوں کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہوچکی تھی کہ ساری کائنات ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔" (صفحہ ۶۹ - ۷۰)

ذرا سوچئے کہ کارلائل کے ایک ایک جملہ کے ثبوت میں آیات قرآنی موجود ہیں۔ وہ "قرآن" کے ان دعاوی کو "محمدؐ" کا جواب کہکر "حکمت" کا بے پناہ

"یہ امر قطعی ہے کہ یورپ کے دورِ جدید کی خصوصی قوت اور اُس کی کامیابی کا راز ہی طبیعی سائنس اور سائنسی رُجحانات ہیں جو اُسے عربوں سے ورثہ میں ملے۔"

مسلمان اپنے رسول کو "معجزات" سے الگ کر کے پیش کر ہی نہیں سکتے اور "قرآن" کو "حدیث" میں چھپائے بغیر اس کی بلندی کا تصور ہی نہیں کر سکتے حد تو یہ ہے کہ "قرآن" کی "حکمت" بھی "حدیث" ہو کر رہ گئی۔ مگر دیکھئے کہ کارلائل (Carlyle) قرآن و محمد میں "حکمت" کا سمندر موج زن پاتا ہے وہ اپنی کتاب "Heroes and Hero Worship" میں لکھتا ہے:۔

"محمد نے کوئی "معجزہ" نہیں دکھایا۔ معجزات کا مطالبہ کرنے والوں کو وہ بلا توقف جواب دیتا کہ میں معجزات نہیں دکھاتا۔ میں تو صرف ایک مبلّغ ہوں اور میرا فرض یہ ہے کہ خدا کی مخلوق تک اس کا پیغام پہنچا دوں۔ اُس کے نزدیک یہ کائناتِ خود ایک عظیم الشان معجزہ تھی۔ وہ کہتا کہ ذرا اس دنیا پر غور کرو اگر تمہاری آنکھیں کھلی ہوں تو یہ بہت بڑی آیت الٰہی ہے۔ یہ زمین جسے خدا نے تمہارے لئے بنایا اور اس میں راستے متعین کئے تم اس پر رہائش رکھتے ہو۔ اس میں چلتے پھرتے ہو۔ پھر ان بادلوں کو دیکھو جو خشک زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ سوچو کہ یہ کہاں سے آتے ہیں اور کس طرح ہوا میں معلق رہتے ہیں

جُدا کر دیجئے تو پھر انسان کچھ نہیں ہے کبھی مسلمان دُنیا میں فائق و برگزیدہ تھے تو اسی علم و حکمت کی بنا پر، اور اگر آج یہودی و عیسائی مسلمانوں پر ترجیح رکھتے ہیں تو اسی علم و حکمت کی وجہ سے۔ ڈھائی تین سو برس تک مسلمان دُنیا میں سربلند و پیشوا بنے ہوئے تھے اس وقت "حکمت" کو سمجھتے تھے کہ کیا ہے اور جب سے "حکمت" کے معنی بدلے اس وقت سے مسلمانوں کا جو عالم ہے وہ دیکھ لیجئے۔ جب صرف ایک کتاب "قرآن" مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی تو وہ حکمت کے دریا بہا رہے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس میں حکمت کے جو نکتے پاتے تھے اُس کی تلاش و جستجو میں لگ جاتے تھے۔ آج بھی حکمت کا کونسا نکتہ ہے جو اس قرآن میں موجود نہیں ؟ ؛ ؎

تو رہ شناس نئی، وز مقام بے خبری
چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمٰی نیست (اقبال)

ہاں البتہ "حکیم" نہیں ہیں جو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ نیوٹن نے اگر سیب کو گرتے دیکھ کر یہ نکتہ پایا کہ اس کو جاننا چاہیئے کہ ہر چیز زمین ہی کی طرف کیوں رجوع کرتی ہے ؟ اور پھر اُس نے دریافت کر لیا کہ زمین میں کشش ہے، تو کوئی تعجب نہیں۔ اصحاب فیل کی خود مکہ میں کنکریوں سے تباہی کا ذکر کیا اس طرف مسلمانوں کو اشارہ نہیں کر رہی تھی کہ لوگ سوچیں کہ آخر اوپر سے کنکریوں کے گرنے سے لشکر کیوں تباہ ہُوا ؟

تَرْمِيهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ "اُن لوگوں پر کنکر کی پتھریاں برساتے تھے"

(فیل ۱)

خزانہ قرار دیتا ہے۔ یہ ہے "حکمت" جو قرآن" میں کارفرما اور موجود ہے اور جس کے سبب "قرآن" نے اپنے آپ کو اَلْحَکِیْم کہا ہے۔ مگر ہمارے دیدہ وروں کو "حکمت" کے معنی "حدیث" معلوم ہیں۔ بات یہی ہے کہ

یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ — "ہم حکمت تو اُسی کو عطا کرتے ہیں جو چاہتا
وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ — ہے اور جسے حکمت مل جائے تو سمجھ
اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ط (بقرہ ۲۷۰) — کہ اُسے بڑی چیز مل گئی"

میں کیسے سمجھاؤں اپنے اُس عزیز صاحب علم دوست کو کہ "حکمت" "حدیث" کا نام نہیں ہے۔ بلکہ "حکمت" خود "قرآن" ہے اس لئے کہ وہ علم و حکمت کا مخزن و منبع ہے اور "حکمت" "قرآن" سے باہر کسی اور کتاب میں نہیں بلکہ قرآن ہی کے اندر ہے اور یہ علم و حکمت ہی ہے جس کی بدولت فرشتے انسان کے سامنے سربسجود ہو گئے تھے۔ یہ علم حکمت ہی ہے جس کی کشش نے معلم الملکوت کو آدم کی تخلیق کے بعد فرشتوں سے ناطہ توڑ کر انسان کے ساتھ رہنے پر آمادہ کیا۔ میرے عزیز دوست! کشمکش حیات میں پُرکیف جاذبیتیں ہیں تو صرف علم و حکمت سے کشاکش زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی علم و حکمت کے دم سے۔ بربط ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمے بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب علم و حکمت سے یہاں تک کہ اگر انسان کسی کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے تو صرف اسی علم و حکمت کی بدولت اور اگر خود کسی کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے تو محض اسی علم و حکمت کے سبب۔ انسان کا تعلق علم و حکمت سے ایسا ہے کہ اگر اس کو انسان سے

نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط (بقرہ ۴) "اور ہم تو تیری حمد و تسبیح کر رہے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہی رہتے ہیں۔"

اسی "علم الاشیاء" کا نام "حکمت" ہے۔ اور اسی "حکمت" سے باخبر شخص کو قرآن "عالم" کہتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کس شدت سے مادی کائنات کی طرف مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی جاتی ہے:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ط وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۝ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ط (فاطر ۴)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے بلندیوں سے پانی اُتارا اور اس کے ذریعے مختلف رنگ کے پھل اُگائے اور پہاڑ بنائے جن میں سفید، سرخ اور دوسرے رنگوں کی دھاریاں ہیں اور سیاہ بھی! اور انسان اور درندے اور چوپائے بھی اسی طرح مختلف رنگوں کے ہیں۔"

ان شعبہ ہائے علم و حکمت اور مظاہر فطرت کے تذکرے کے بعد قرآن کہتا ہے:۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (فاطر ۴) "بیشک خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اہل علم ہیں۔"

کیا اس سے صاف ظاہر نہیں کہ "علما" وہی ہیں جو علوم فطرت اور حکمتِ کائنات کی گہرائیوں میں جا کر خالق حقیقی کی عظمت کا ادراک حاصل

کیا یہ کوئی انوکھا واقعہ تھا؟ قومِ لوط کی تباہی بھی تو اسی طرح ہوئی تھی اور یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس میں "آیت" "نشانی دلیل اور نکتہ ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝ (الحجر ۵)

"اور ہم نے اُن پر کنکر کی پتھریاں برسائیں اور اس میں نکتہ ہے ان کے لئے جو اہلِ بصیرت ہیں"

کیا "کششِ ارضی" کا نکتہ پالینے کے لئے اتنا اشارہ کافی نہ تھا۔؟ آخر نیوٹن نے سیب گرنے سے کیسے نکتہ پالیا؟ اللہ پکار کے نہیں کہتا بس یوں ہی اشارے کیا کرتا ہے۔ قابیل نے ہابیل کو مار دیا اور جب لاش چھپانے کے لئے پریشان ہوا تو یوں اشارہ کیا گیا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْاَةَ اَخِيْهِ (مائدہ ۵)

"پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو وہاں پہنچکر زمین کھودنے لگا۔ تاکہ اس کو بتا دے کہ کس طرح اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے"

آج مسلمانوں کے نزدیک "مسلمان" یا "انسان" کی خصوصیت دُنیا کی ساری چیزوں سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر صرف روزہ نماز کرنا ہے۔ حالانکہ "انسان" کی افضلیت "فرشتے" پر محض بربنائے علم و حکمت عمل میں آئی تھی۔ انسان کو "خلیفۃ الارض" یعنی "زمین کا مالک" بنایا گیا تھا اسی لئے علم و حکمت اُسے تفویض کیا گیا تھا:۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا "اور ہم نے آدم کو علم الاشیاء عطا کر دیا"

نماز روزہ وجہِ امتیاز تو صرف فرشتوں کے لئے تھا۔

"اُمّی"

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم! اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

میرے ایک مخلص محترم نے جاننا چاہا ہے: کہ:-

"نبی اکرم اور پیغمبرِ اعظم سے متعلق قرآن مجید میں بہت سے القاب و الفاظ آئے ہیں۔ منجملہ ان کے ایک لفظ "اُمّی" بھی ہے جو سورۂ اعراف کے اُنیسویں اور بیسویں رکوع میں دو جگہ آیا ہے:-

(۱) اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ ط — "وہ لوگ جو رسول نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں"

(۲) فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ — "سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی پر"

لفظ "اُمّی" کے معنی و مفہوم میں بڑا اختلاف ہے۔ اس کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

زیرِ نظر مضمون، اسی سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔

کرتے ہیں؟ وہ لوگ جو اپنے گرد و پیش کے مظاہر قدرت سے بے خبر رہتے ہیں اور جنھیں اپنے ماحول کے ادراک کی خواہش نہیں وہ تو اندھے ہیں اور جو اس دُنیا میں اندھا رہا وہ ہر جگہ اندھا ہی رہے گا۔

بہر حال! "حکمت" قرآن کے اندر ہے کہیں باہر نہیں۔ اور رسول اللہ کی تعلیم کتاب و حکمت، قرآن سے باہر کسی اور کتاب سے نہیں تھی۔ لہذا یہ سمجھنا کہ آیت زیر بحث میں "کتاب" سے مراد "قرآن" اور "حکمت" سے مراد "حدیث" ہے، ہٹ دھرمی اور قرآن سے بے خبری کے سوا کچھ اور نہیں۔ رسول اللہ قرآن پڑھ پڑھ کر سناتے تھے اور اسی "قرآن" سے کتاب و حکمت کی تعلیم فرماتے تھے اور کتاب و حکمت سے مراد وُہ علوم و فنون ہیں جو قرآن مسلمانوں کو بخشتا ہے۔

سارے لوگ یہی کہتے ہیں کہ "اُمّی" ہر جگہ قرآن میں بمعنی "اَن پڑھ" آیا ہے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور قرآن میں کسی جگہ بھی "اُمّی" کا لفظ بمعنی "اَن پڑھ" نہیں آیا ہے۔

"روایات" متضاد ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبی" جلد سوم (چھوٹی تقطیع) کے صفحہ ۴۷۸ سے ۴۸۸ تک بڑی لمبی بحث کی ہے اور اُن روایات کو جن سے آنحضرت صلعم کا لکھا پڑھا ہونا ثابت ہوتا ہے،

"تمام تر موضوع یا نہایت ضعیف"

فرمایا ہے اور رسول اللہ کو اُمّی "یعنی "اَن پڑھ" قرار دیا ہے برخلاف اسکے علامہ نیاز فتحپوری نے "مجموعۂ استفسار و جواب" جلد سوم صفحات ۳۶۴ تا ۳۶۹ پر بحث کرتے ہوئے اُن تمام روایتوں کو موضوع بتایا ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ مطلقاً "اَن پڑھ" تھے اور عمر بھر رہے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:-

"قبل نزول وحی تو آپ کا نوشت وخواند سے ناواقف ہونا مسلّم ہے۔ لیکن نبوت کے بعد اس باب میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے۔ میری رائے یہی ہے کہ بعثت کے بعد آپ نے معمولی نوشت وخواند سے واقفیت حاصل کر لی تھی"

انھوں نے اس خیال کے ثبوت میں بطور دلیل یہ آیت پیش کی ہے:-

میرے محترم! ہمارے یہاں "اتفاق" کس بات پر ہے؟ کسی موضوع پر بھی سارے مسلمان متحد الرائے اور متفق الخیال ہیں؟ اقبال نے اظہار مسرت کیا تھا کہ :-

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لئے!
کہ یک زباں ہیں فقیہان شہر میرے خلاف

مگر اس مسئلے میں بھی اختلاف ہو کے رہا۔ آپ رسول اللہ کی "صفات" میں اختلاف کا ذکر فرما رہے ہیں۔ کیا "ذات" میں تمام مسلمانوں کا کسی امر پر بھی اتفاق ہے؟ رسالہ دار العلوم دیوبند میں مسلسل شائع ہونے والے مقالہ "دنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا؟" کی بارھویں قسط (اپریل ۱۹۵۲ء) میں فاضل مقالہ نگار نے کیا صاف صاف فرمایا ہے کہ :-

"اگر یوں کہہ دیا جائے کہ آپ کے سنہ ولادت، ماہ ولادت، تاریخ ولادت، یوم ولادت سب ہی میں اختلاف ہے، تو غالباً اس میں زیادہ مبالغہ نہیں ہے۔"

اسی لئے تو "اجماع" کی اصطلاح گھڑی گئی۔ یعنی اگر دس آدمی "دن" کو "رات" کہدیں تو مان لو۔ چاہے تم کو سورج چمکتا ہوا نظر ہی کیوں نہ آرہا ہو۔ اور اگر کہیں اختلاف کیا تو فوراً کفر کا فتویٰ موجود۔ لہٰذا اگر لفظ "اُمّی" کے معنی و مطلب میں اختلاف ہے تو کوئی تعجب نہیں۔ بہر حال! جہاں تک میرا مطالعہ ہے "اُمّی" کے معنی میں کوئی اختلاف نہیں ہے یعنی

ان دونوں آیتوں میں اہل مکّہ سے خطاب ہے۔ اگر "اُمّیین" کے معنی "اَن پڑھوں" ہے تو یہ تعریف اہل مکّہ کی ہوئی۔ حالانکہ یہ صریحًا غلط ہے کہ "اہل مکہ" لکھے پڑھے نہ تھے۔ اُن کے لکھے پڑھے ہونے کا یہی ثبوت کیا کم ہے کہ انھوں نے "سبعہ معلقہ" لکھ اور لکھ کر چیلنج کے طور پر خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی اور پڑھا لکھا ہے تو وہ ان کا جواب دے اور واقعہ نے ثابت کیا کہ سوا خدا کے کوئی دوسرا، اُن کے اس چیلنج کا جواب نہ دے سکا۔ اہل مکّہ کے لکھے پڑھے ہونے کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہیئے کہ خود خدا نے بھی اُن کو چیلنج کیا کہ اگر تم کو قرآن کی صداقت میں شک ہے تو اس جیسا قرآن یا کچھ ہی سورۃ بنا لاؤ؟ اگر اہل مکّہ لکھے پڑھے نہ ہوتے تو قرآن اُن کو اس طرح چیلنج ہرگز نہ کرتا کیونکہ "اَن پڑھوں" سے کسی "کتاب" کے جواب میں، ویسی ہی کوئی "کتاب" پیش کرنے کا کوئی عقلمند تو مطالبہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ ایسا سوال تو لکھے پڑھے لوگوں ہی سے ہو سکتا یا کیا جا سکتا ہے۔ اہل مکّہ کے لکھے پڑھے ہونے کا یہی ثبوت کیا کم ہے کہ ان دونوں آیتوں میں اہل مکّہ کو قرآن کے نزول سے قبل گمراہی میں مبتلا بتلایا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ وہ اس سے پہلے "اَن پڑھ" تھے۔ اس گمراہی کی تخصیص ہی سے صاف ظاہر ہے کہ قبل از نزول قرآن اُن کے "اَن پڑھ" ہونے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ نیز نزول قرآن کے بعد اہل مکّہ "لکھے پڑھے" تو بن نہ گئے تھے جو یہاں اُن کے "اَن پڑھ" ہونے کا ذکر کیا گیا؟ اہل مکّہ کے

مَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (عنکبوت ۵)

"تم اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔"

اُن کے خیال میں اگر بعثت کے بعد بھی رسول لکھنے پڑھنے سے مطلقاً مجبور ہی تھے تو اس آیت میں "مِنْ قَبْلِهٖ" نہ آتا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ بعثت کے قبل آپ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے مگر بعثت کے بعد لکھ پڑھ سکتے تھے۔

آپ نے یہ سوال تو کیا نہیں تھا۔ مگر میں نے محض یہ دکھانے کو اس کا ذکر کیا کہ اس باب میں بھی اختلاف ہے۔ آپ نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ میرے نزدیک لفظ "اُمّی" کس معنی میں، قرآن میں آیا ہے؟ سو اس بارے میں یہ دو آیتیں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ..... وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (جمعہ ۱)

"وہ ایسا ہے جس نے اُمّیین میں اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا ... اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔"

(۲) بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ .... وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ

"ان میں ایک رسول بھیجا، اُن ہی میں سے، ..... اور اس سے پہلے وہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔"

(آل عمران ۱۶۴)

ہوتا ہے جو ایک طرح کی مرکزیت و جامعیت رکھتی ہوں۔ جیسے سر کا درمیانی حصہ کہ اس کو "اُمّ الرّاس" کہا جاتا ہے۔ "اُمّ" فوج کے جھنڈے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اسی مرکز کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ عربوں کے محاورے "الخمر اُمّ الخبائث" یا "التقبض اُمّ الامراض" یا "الکذب اُمّ الجرائم" وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ "اُمّ" کے معنی اصل، جڑ، مرکز وغیرہ کے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے پیغمبروں اور اُن کی کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے تمام کتابوں کا اصل مرکز اور منبع و مخزن اپنے پاس ہونا بیان کیا ہے:۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (رعد ۶)

"خدا جس حکم کو چاہے موقوف کر دے اور جس کو چاہے قائم رکھے۔ اصل کتاب اس کے پاس ہے"

قرآن مجید کی محکم آیات کو "اُمّ الکتاب" کہا گیا ہے اس لئے کہ وہ اصل کتاب یعنی کتاب کا مرکزی جزو ہیں:۔

هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ (آل عمران ۱) "وہی اصل کتاب ہیں"

خود مکہ کو "اُمّ القریٰ" کہا گیا ہے اس لئے کہ وہ قوم عرب کی عقیدت مندیوں کا قبلہ، حجاز کی اجتماعی زندگی کا مرکز اور ملک عرب کا صدر مقام تھا۔ نزول کتاب کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے:۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (شوریٰ۔ انعام ۱) "تاکہ تم مکہ والوں اور اس کے آس پاس والوں کو ڈراؤ"

لہٰذا سورۂ اعراف کی اُن دونوں آیتوں میں جو آپ نے پیش کی ہیں،

لکھے پڑھے ہونے کا یہی کم ثبوت ہو گیا کہ آنحضرت صلعم کے بیبیوں کا تب وحی لکھتے تھے ؟ یہی ثبوت کم ہے کہ صلح حدیبیہ میں اہل مکہ اور آنحضرت کے درمیان صلح نامہ لکھا گیا ؟ ۔ اہل مکہ کے لکھے پڑھے ہونے کا یہ ثبوت کیا کم ہے کہ غزوۂ بدر میں جو لوگ گرفتار ہوئے تھے اُن میں سے بہتوں کا فدیہ یہ قرار پایا تھا کہ وہ اہل مدینہ کے بچوں کو "لکھنا پڑھنا" سکھا دیں ؟ اگر اہل مکہ "لکھے پڑھے" نہیں بلکہ "اَن پڑھ" تھے تو یہ سب کیوں اور کیسے ہوا ؟ لہذا اہل مکہ کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ "لکھے پڑھے" یا "نوشت و خواند سے واقف" نہیں تھے ۔ پھر اُن کو "اُمّی" کیوں کہا گیا ؟ اس سے صاف ظاہر ہے کہ "اُمّیین" بمعنیٰ "اَن پڑھوں" ہرگز قرآن نے استعمال نہیں کیا ہے اس کو یوں بھی دیکھیے کہ "بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ" (اُمّیین میں سے اٹھایا) کی جگہ پر دوسری آیت میں بَعَثَ فِیْھِمْ (اُن میں سے اٹھایا) آیا ہے ۔ اگر "اُمّیین" بمعنیٰ "اَن پڑھوں" استعمال ہوتا تو دوسری آیت میں اس کی جگہ پر "فِیْھِمْ" نہ آتا کیونکہ "اَن پڑھوں" اور "اُن ہی میں" میں کوئی معنوی ربط نہیں۔ لہذا یہ بات قطعی ہے کہ "اُمّی" کا لفظ قرآن نے ہرگز بمعنی "اَن پڑھ" استعمال نہیں کیا ہے اور جہاں جہاں لفظ "اُمّی" یا "اُمّیین" آیا ہے اس کا مطلب کچھ اور ہے ۔

محاورہ عرب کی رُو سے لفظ "اُم" کے معنیٰ "اصل" کے ہیں ۔ اسی لئے "ماں" کو "اُم" کہتے ہیں ۔ حضرت عیسیٰ سے پوچھا جائے گا کہ اِتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ الٰھَیْنِ ط (مائدہ ۱۱) در اصل "اُم" کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر

"اَن پڑھ" کی خصوصیت کا اظہار کوئی معنی بھی دیتا مگر "ایمان لانے" کو نبی کے "پڑھے لکھے" اور "بے پڑھے لکھے" ہونے سے کیا تعلق ؟ تب تو نعوذ باللہ یہ ایک لغو بات اور بھرتی کا لفظ ہے !

عرب کا "اُم" (اصل، جڑ، مرکز، صدر مقام) مکہ تھا۔ جہاں کے آپ خود رہنے والے تھے اور جہاں بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔ اس شہر کو وہ عظمت حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کی قسم کھائی ہے یہودیوں کو "نبی اُمّی" سے جو چڑ یا کد تھی وہ اس لئے نہیں کہ آپ "اَن پڑھ" تھے۔ بھلا بے پڑھے لکھے ہونے سے اُن کو کیا بحث۔ وہ تو آنحضرت سے اس لئے چڑتے اور کد رکھتے تھے بلکہ نفرت کرتے تھے کہ آپ "رسول عربی" اور "مکی نبی" کیوں تھے ؟۔ عیسائیوں اور یہودیوں کو یقین تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے جس کی بشارت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی دی تھی (اعراف ۱۹) اور حضرت عیسیٰ نے بھی (الصف ۱) چنانچہ وہ اُس نبی کے منتظر تھے مگر سمجھتے تھے جس طرح اس سے قبل جس قدر بھی انبیاء مبعوث ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل ہی میں سے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ نبی بھی بنی اسرائیل ہی میں سے ہوگا یعنی اُسے فلسطینی ہی ہونا چاہیئے۔ مگر جب وہ نبی "مکہ" میں مبعوث ہوا اور عرب میں ظاہر ہوا جو اُس وقت دُنیا کا سب سے اسفل ترین خطۂ ارض سمجھا جاتا تھا۔ تو یہود آگ بگولہ ہوگئے۔ کیونکہ نسلی عصبیت اور نسبی غرور کی بنا پر وہ دنیا میں صرف اپنے ہی کو سب سے زیادہ معتمد اور محترم اور عربوں کو سب سے زیادہ ذلیل و خوار سمجھتے تھے لہذا وہ ایک "عربی رسول" اور "مکی نبی" کے سامنے

جو "نبی اُمّی" آیا ہے اُس کے معنی ہرگز :۔

"اَن پڑھ نبی"

نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد :۔

"مکّہ والا نبی"

ہے۔ قرآن نے، رسول کی صداقت کے سلسلہ میں رسول کے قبل از بعثت "اَن پڑھ" ہونے سے استدلال ضرور کیا ہے۔ مگر خود ہی دیکھ لیجئے کہ وہاں نہ تو "اُمّی" کا لفظ استعمال کیا ہے اور نہ رسول کے "اَن پڑھ" ہونے کو بطور صفت استعمال کیا ہے۔ لہٰذا "اُمّی" کے معنی "اَن پڑھ" سمجھنا اور متذکرہ دونوں آیتوں میں "نبی اُمّی" کا یہ مطلب لینا کہ "اَن پڑھ نبی پر ایمان لاؤ"۔ محض بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ "اَن پڑھ" ہونا "نبی" کی کوئی ایسی اعلیٰ صفت نہیں جس کا تعلق "ایمان لانے" سے ہو۔ یا اس صفت کا مخاطب پر کوئی اثر پڑے۔

(۱) جو لوگ اَن پڑھ نبی کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) سو ایمان لاؤ اَن پڑھ نبی پر

سوچئے تو کہ کیا بات ہوئی؟ ایمان و اتّباع کا تعلق نبوّت سے ہے نہ کہ اس نبی کے پڑھے لکھے یا اَن پڑھ ہونے سے؟ پھر ایسے نبی پر ایمان لانے میں کیا خوبی مترتب ہوتی ہے جو "اَن پڑھ" ہو؟ آخر اللہ تعالےٰ نے یہ کیا مہمل بات کہدی؟ مکہ والوں میں "نبی" کی عظمت خود نبی کے "مکّی" ہونے سے ہوگی یا اُن کے "اَن پڑھ" ہونے سے؟ پڑھائی لکھائی کا ذکر ہوتا تو

آل عمران مدنی سورہ ہے۔ مدینہ میں یہود و نصاریٰ تھے مگر مکہ میں نہیں۔ وہاں سب مشرک و کافر ہی تھے۔ اگر لفظ "امیین" کے معنی "ان پڑھوں" ہوتا تو یہاں یہ لفظ ہرگز استعمال نہ ہوتا کیونکہ "اہل کتاب" ہونا اور "ان پڑھ" ہونا دو بات ہے۔ "اہل کتاب" کے معنی "پڑھا لکھا ہونا" نہیں بلکہ "صاحب دین" ہے۔ چاہے وہ لکھے پڑھے ہوں یا ان پڑھ۔ اسی طرح مشرکین مکہ میں پڑھے لکھے بھی تھے اور ان پڑھ بھی۔ پھر ان کو "امیین" کیوں کہا گیا؟ مطلب صاف ہے کہ:۔

"مدینہ اور مکہ والوں سے پوچھو کہ
کیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟"

لہذا یہ قطعی ہے کہ "امیین" کے معنی "مکہ والے" ہیں۔ مدینہ کے یہودیوں اور عیسائیوں نے مکہ والوں کو "بے دین" قرار دیا تھا اور واقعی وہ بے دین تھے ہی، مگر ان کی بے دینی کے سبب مدینہ کے بعض یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مکہ والوں کی امانتوں میں خیانت کرنا کوئی گناہ نہیں کیونکہ ان کے نزدیک مکہ والوں کا مرتبہ ایسا نہ تھا کہ ان کے باب میں خدا اہل دین سے کوئی باز پرس کرے۔ چنانچہ آنحضرت صلعم سے ان اہل کتاب کی اس غلط فہمی کا ذکر یوں کیا جاتا ہے کہ بعض تو ان میں وہ ہیں کہ اگر ان کے پاس ایک اشرفی امانت رکھدو تو وہ خیانت نہ کریں گے اور واپس کر دیں گے۔ مگر زیادہ وہ ہیں جو ایک دینار بھی امانت واپس نہ کریں اگر انھیں مجبور نہ کیا جائے:۔

سر تسلیم خم کرنا، اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔

اَنْ یَّکْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ	"یہ انکار کرتے ہیں۔ ایسی چیز کا جو اللہ نے
بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ	نازل کی ہے محض اس ضد پر کہ کیوں اللہ
عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ	نے اپنے فضل سے اس بندے پر اس کو
(بقرہ ۱۱)	نازل کیا جس پر کہ اس کو منظور ہوا؟"

اسی لئے آنحضرت صلعم کو بتایا گیا کہ تم کو یہ لوگ کبھی بھی گوارا اور برداشت نہ کریں گے، اس لئے کہ تم عرب ہو۔ چاہے تم اُن کا دین ہی کیوں نہ قبول کر لو۔

لَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَھُوْدُ	یہ یہودی اور عیسائی تم سے کبھی بھی راضی
وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ	نہ ہوں گے۔ اگر چہ تم اُن ہی کی ملت کے
مِلَّتَھُمْ (بقرہ ۱۴)	پیرو کیوں نہ بن جاؤ۔"

اس ضد اور ہٹ کی وجہ کیا تھی؟ صرف یہ کہ یہ رسول مکہ میں کیوں مبعوث ہوا؟ یہ مکی نبی اور عرب رسول کیوں ہے؟ لہٰذا قرآن میں جہاں بھی "اُمّی" کا لفظ آیا ہے وہاں اس سے مراد "اَن پڑھ نبی" ہرگز نہیں بلکہ "مکی نبی" ہے اور "اُمّیین" کے معنیٰ "مکہ والوں" کے ہیں۔ عام دعوت اسلام کا حکم دیا جاتا ہے کہ:-

قُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ	"اہل کتاب اور مکہ والوں سے پوچھو کہ
وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ	کیا تم اسلام قبول کرتے ہو؟"

(آل عمران ۲)

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" کے جواب میں ایک جگہ "بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ (آل عمران ۱۶۴) اور دوسری جگہ "بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ (جمعہ ۱) آیا ہے اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ "اُمّیین" سے مراد "اہل مکہ" ہیں نہ کہ "اَن پڑھوں"؛ کیونکہ حضرت ابراہیم و اسمعیل علیہم السلام کی دعا "اَن پڑھوں" میں سے، اُن ہی میں کا ایک "اَن پڑھ" رسول بھیجنے کی تو تھی نہیں بلکہ مکہ والوں میں، مکہ والوں ہی میں سے ایک رسول بھیجنے کی دعا تھی۔ لہذا یہ قطعی ہے کہ "اُمّی" کے معنی "اَن پڑھ" نہیں بلکہ "مکی" اور "اُمّیین" یا "اُمّیّون" کا مطلب "اَن پڑھوں" نہیں بلکہ "مکہ والوں" ہے۔ ہر قوم میں رسول بھیجے گئے ہیں اور ہر قوم کے اکابرین، بالعموم اُس ملک کے صدر مقام اور مرکزی شہر یا مقام ہی میں رہا کرتے ہیں۔ لہذا ہمیشہ رسول اور نبی اُس قوم اور اس ملک کے صدر مقام اور مرکز ہی سے مبعوث ہوتے ہیں:-

مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرَىٰ حَتَّىٰ يَبْعَثَ فِي أُمِّهَا رَسُولًا يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا (قصص ۶)

"تمہارا پروردگار بستیوں کو ہلاک اس وقت تک نہیں کیا کرتا جب تک کہ اس کے صدر مقام میں کسی رسول کو بھیج نہیں لیتا ہے کہ وہ ہماری آیتوں کو پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سنائے"

دیکھ لیجئے "اَن پڑھوں" کی شرط نہیں بلکہ بستی کے صدر مقام اور مرکز کی شرط ہے جس کے لئے لفظ "اُمّ" آیا ہے۔ لہذا جب عرب

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (آل عمران ۸)

"یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ مکہ والوں کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں"

دشمنانِ اسلام کی چالبازیوں کا ذکر ہوتا ہے جس میں مدینہ کے اہل کتاب اور مکہ کے کفار دونوں شریک تھے۔ چنانچہ یہودیوں اور عیسائیوں کی چالبازیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے:۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (بقرہ ۹)

"اور اُن ہی میں مکہ والے بھی ہیں جو کتاب سے بے خبر ہیں اور محض خیالی پلاؤ پکایا کرتے ہیں"

غرض اسی طرح تمام آیتوں سے ظاہر ہے کہ "نبی اُمّی" سے مراد "اَن پڑھ نبی" نہیں ہے بلکہ "مکی نبی" ہے اور "اُمّیین" یا "اُمّیّون" سے مراد "اَن پڑھوں" نہیں بلکہ "مکہ والوں" ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب کعبہ کی دیواریں اٹھائی جا رہی تھیں تو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے متفقہ دعا کی تھی کہ:۔

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ (بقرہ ۱۵ - و آل عمران ۱۰)

"ان لوگوں میں، ان ہی میں سے ایک رسول بھیجئے"

اسی کو اللہ تعالیٰ نے یوں پورا کیا۔

أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ (بقرہ ۱۸)

"ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے"

ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے کسی نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق تو کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے ؟"

قرآن کے لفظ "اُمّی" کو بمعنی "ان پڑھ" حرزِ جاں بنا لینے کا کیا حاصل ہوا ؟ یا ہو رہا ہے۔ اس لفظ کی غلط معنی آفرینی نے مسلمانوں پر کیا قہر توڑا ہے اس کا کچھ اندازہ کرنے کے لئے آیئے میں آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ ایک صاحب نے صوبہ بہار کے مشہور ضلع اور مسلم اکثریت والے حلقہ یعنی "پورنیہ" کے بارے میں جہاں تقریباً بارہ لاکھ مسلمان آباد ہیں ایک مضمون مدینہ (بجنور) مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۵۲ء میں شائع کرایا ہے جس میں وہ اس ضلع پر اثر رکھنے والے مولویوں اور پیروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"یہاں مسلم آبادی کے جس حلقہ میں آپ تشریف لے جائیں درجنوں کی تعداد میں کرم فرمایان قوم اور تقدس مآبان ملت، مقدس لباسوں میں ملبوس اور معصوم لبادوں میں ملفوف ..... سادہ لوح مسلمانوں کو مسحور کرنے کے لئے ساحرانہ ہیئت کذائی میں جلوہ گر نظر آئیں گے۔ ان بزرگوں کی عزت و وقعت سادہ لوح مسلمانوں کے دلوں اور ان کی جیبوں پر ان کا قبضۂ غاصبانہ، چونکہ سنگین قسم کی جہالت و گمراہی کی وجہ سے ہے، اس لئے یہ سالکان راہ طریقت و ماہران فن تصوف،

میں رسول مبعوث ہونا ہوا تو وہ اُس کے صدر مقام اور مرکز "اُمّ القریٰ" سے مبعوث ہُوا جس کو "مکہ" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا "نبی اُمّی" کے معنی "اَن پڑھ نبی" ہرگز نہیں بلکہ "مکہ والا نبی" ہے۔ اسی طرح "اُمّیین" اور "اُمّیّون" سے مراد "اَن پڑھوں" نہیں بلکہ "مکّہ والوں" ہے۔ وہ نہ تو "اَن پڑھ" تھے اور نہ ان کو کبھی بھی کسی معنی کر "اَن پڑھ" کہا جا سکتا تھا۔ اسی طرح "اَن پڑھ" ہونا کوئی خوبی بھی نہیں ہے جس کو رسول کے ساتھ "قرآن" ضرور ہی وابستہ اور منسلک کرتا۔ مگر ہمارے یہاں تو ہر وہ چیز جو مشہور ہو کر جزو اسلام بن گئی ہے، وہی صحیح ہے کسی کو غور و فکر کی توفیق ہی نہیں ہوئی۔ بقول علامہ ابوالکلام آزاد:۔

(۱) "اسلام کی ابتدائی صدیوں[1] سے لے کر قرون آخیرہ تک جس قدر مفسّر پیدا ہوئے، اُن کا طریق تفسیر ایک روبہ تنزّل معیار فکر کی مسلسل زنجیر ہے"

(۲) "یہ صورت حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام دماغی تنزّل کا قدرتی نتیجہ تھا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ قرآن کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ اُن کی پستیوں کا ساتھ دے سکے"

(۳) اگر تیسری صدی[2] میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے، تو ضروری

---

[1] و [2] قرآن کی سب سے پہلی مکمل تفسیر تیسری صدی ہجری کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں لکھی گئی ہے سب سے پہلے مفسر قرآن ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ / ۹۲۲ء ہیں۔

(۳) "علم" کے فتنے سے بچنے کے لئے مسلمانوں اور عاشقان رسول کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَکْبَر یعنی خدا اور بندے کے درمیان "علم" بدترین پردہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا اور نہ اسلام کے دوسرے اسرار و رموز ہی کو سمجھ سکتا ہے۔

(۴) مدرسوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ "علم ظاہر" ہے۔ اس لئے "پڑھنے" سے انسان گمراہ، بے دین اور ملحد ہو جاتا ہے "علم ظاہر" جس قدر پھیلتا جاتا ہے۔ لوگ خدا سے باغی اور نافرمان بنتے جاتے ہیں۔"

اور بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ میں کہاں تک نقل کروں۔ اس سے اندازہ کیجئے کہ "قرآن" کے ایک لفظ کو غلط سمجھنے کے کیسے تباہ کن اثرات مسلمانوں میں پھیل گئے ہیں۔ مگر ہمارے علما و فضلا تک اسی تارِ عنکبوت میں گرفتار ہیں۔ ذرا دیکھئے کس وثوق و اعتماد سے علامہ سید سلیمان ندوی "سیرۃ النبی" صفحہ ۴۸۸ پر اپنا مقالہ یوں ختم کرتے ہیں۔

"قرآن نے آپ کو بار بار اور برملا "اُمّی" کہا ہے۔ اس سے زیادہ ثبوت اس کا اور کیا چاہیے؟"

انھوں نے اس موضوع کا عنوان ہی یوں قائم کیا ہے:-

اپنے علم و تجربہ اور فضل و تقدس کا سارا زور اس پر صرف کر رہے ہیں کہ یہاں کے مسلمانوں میں کسی طرح "تعلیم" نہ پھیلنے پائے بلکہ جہاں تک ہو سکے جہالت و گمراہی کو عروج، فضول و لایعنی رسومات اور بدعات کو فروغ ہو، کہ پیری و مریدی کی تجارت پر آنچ آنے کا خدشہ نہ رہے۔ یہ بزرگان روشن ضمیر جس قسم کی تعلیمات سے عوام کی روح کو بیدار اور ایمان کو تازہ کر رہے ہیں اور جس قسم کے ارشادات عالیہ کے ذریعے مسلمانوں کو "علم" کے فتنے سے بچا کر پیری مریدی کے کاروبار پر فریفتہ کر رہے ہیں۔ اُن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم خود "اُمّی" تھے یعنی پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس لئے سارا کار راہِ طریقت و جاں نثاران رسول کے لئے افضل ترین عبادت و بزرگ ترین ریاضت "اَن پڑھ" رہنا ہے۔

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کسی مدرسہ میں جا کر پڑھا اور نہ آپ نے کوئی مدرسہ قائم کیا۔ اس لئے مدرسہ قائم کرنا یا کسی مدرسہ میں جا کر پڑھنا خدا کی نافرمانی، رسول سے بغاوت اور دین اسلام سے منہ موڑنا ہے۔ مدرسہ میں پڑھنے والا خدا کی خوشنودی حاصل نہیں کر سکتا:۔

خلاف پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

اب کون صورت ہے جو ایک متوارث عقیدہ و خیال بدلے؟ جو لوگ "قرآن" میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کو یہ مُلّا ملحد و بے دین بتاتے ہیں۔ پھر عوام کے دن پھریں تو کیسے؟ خدا ہم مسلمانوں کے حال پر رحم کرے

اُمیّت

یعنی

"آنحضرت صلعم کا ظاہری تعلیم اور نوشت وخواند کے داغ سے پاک ہونا"

اَلرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ

(اعراف)

بھلا اب سوچئے کہ اس کتاب کو پڑھ کر مُلّا "بے چارے مسلمانوں کو جو یہ سمجھاتے ہیں کہ "علم" ایک "داغ" ہے جس سے رسول اللہ پاک تھے لہٰذا تم بھی اپنے میں یہ داغ نہ لگنے دو، تو وہ کیا انوکھا کام کر رہے ہیں؟ اور جب علامہ ندوی موصوف کے پیرمیاں علامہ اشرف علی تھانوی کے ترجمہ کے حاشیہ پر عام مسلمان روزانہ یہ پڑھتے ہیں کہ:-

(۱) "اَن پڑھ کہتے تھے۔ عرب کے لوگوں کو کہ ان کے پاس اگلے پیغمبروں کا علم نہ تھا" (حاشیہ آل عمران ۱)

(۲) "حضرت کو پہلی کتابوں میں "نبی اُمّی" بتایا تھا۔ دو معنوں سے ایک تو "بے پڑھے" تھے اور دوسرے اُمّ القریٰ سے پیدا ہوئے یعنی مکہ سے" (حاشیہ اعراف ۱۹)

تو ظاہر ہے کہ یہی سمجھیں گے کہ جب رسول "بے پڑھے" اور اہل عرب "بے پڑھے" تھے تو "بے پڑھے" رہنا ہی سب سے بڑی اسلامی سعادت ہے۔ اصل یہ ہے کہ "قرآن" میں غور وفکر کرنا تو گناہ عظیم ہے پھر اب

اس سے قبل والے صفحات میں آپ "حکمت" اور "کتاب" کا ذکر پڑھ چکے ہیں جس سے قرآن کے اولین مخاطب بے خبر تھے بلکہ ساری دنیا ناواقف تھی۔ قرآن کا حال معلوم ہی ہے۔ آیئے یہاں "تزکیہ" کے بارے میں ذرا غور کیا جائے کہ اس سے کیا مراد ہے؟"

یوں لفظی معنی کے اعتبار سے تو "تزکیہ" کے معنی پاک کرنے کے ہیں اور رسول کا ایک معمولی فرض لوگوں کو پاک کرنا بھی تھا۔ اور اس میں جسم، لباس اور روح سب کی پاکی داخل ہے مگر یہ لفظ یقیناً کچھ بلند معنی رکھتا ہوگا۔ ورنہ پھر یہ لفظ رکھا ہی کیوں گیا؟ مگر ہماری بدقسمتی کہ اس لفظ "تزکیہ" نے وہ وہ معنی اختیار کر لئے ہیں جو شاید اللہ میاں کے بھی وہم و گمان میں نہ تھے اور جب اقبال نے اُن کو دیکھا تو اُسے کہنا پڑا کہ :-

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغام خدا گفتند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفٰے را

ان ہی میں سے لفظ "تزکیہ" بھی ہے

"تزکیہ" کے معنی "تزکیہ نفس" لے کر صوفیوں نے "معرفت" کی ایک اصلاح گھڑی اور اس سے مراد "باطنی تعلیم" لے لی۔ یعنی رسول اللہ صلعم نے کچھ ایسی باتیں جس سے قلب مصفّٰی اور مزکّٰی ہو۔ کھلے بندوں نہیں بتائیں بلکہ مخفی طور پر بعض منتخب حضرات کو بتائیں جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی اہل خانقاہ تک پہنچی ہیں۔ یہ خدا رسی کی ایک الگ راہ بتائی جاتی ہے اور "طریقت" کے نام سے منسوب ہے۔ چونکہ اس لفظ میں ان شعبدہ بازیوں کے لئے کوئی

"تزکیہ"

رمزِ حیات جوئی، جز در تپش نیابی
در قلزم آرمیدن، ننگ است آبجو را (اقبال)

ہر حکومت یا فرمانروا کا، ہر جگہ کوئی نہ کوئی پیغام رساں ضرور ہوتا ہے۔ جس کا "لقب" بھی مخصوص ہوتا ہے اور "فرض" بھی اور یہ سب کچھ اس ملک کے دستور حکومت، قانون جہانبانی، آئین سلطنت یا مجموعۂ احکام میں ظاہر کیا ہوا رہتا ہے۔ سب سے بڑے حکمراں اللہ تعالےٰ کا بھی ایک پیغام رساں ہوتا ہے جس کا لقب "نبی" اور "رسول" ہوتا ہے۔ محمد الرسول اللہ خدا کے سب سے آخری پیغام رساں تھے اور اُن کے بھی مخصوص فرائض تھے۔ وہ انسانوں کا جو کامل اور ہمیشہ رہنے والا دستور العمل لائے اس میں اُن فرائض رسول کا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا مِّنْکُمْ — "ہم نے تمہیں میں سے، تم لوگوں میں ایک رسول بھیجا
یَتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَکِّیْکُمْ — ہے جو ہماری آیات پڑھ پڑھ کر تم کو سناتا ہے اور تمہارا
وَیُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَیُعَلِّمُکُمْ — تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے
مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (بقرہ ۱۸) — اور تم کو وہ کچھ بتاتا ہے جن کا تم کو علم نہ تھا۔"

صاف کھلے بندوں خدائی احکام لوگوں تک پہنچانے والا۔ رسول کو نہ اس واضح پیغام کے پہنچانے میں ردّ و بدل کا کوئی اختیار تھا اور نہ کچھ چھپانے لکانے کا:۔

یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (مائدہ ۱۰)

علامہ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اے رسول! جو جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب پہنچا دیجئے اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو آپ نے اللہ تعالےٰ کا ایک پیغام بھی نہیں پہنچایا"

کہاں گنجایش ہے اس کی کہ رسول کچھ تو عام لوگوں کو بتائیں اور کچھ خاص لوگوں کے کان میں کہیں اور وہ بھی اس تاکید کے ساتھ کہ اگر تو نے اس بات کو عام کیا تو تیرا حلق کاٹ دیا جائے گا؟ ۔ رسول کا تو بزبان وحی اعلان تھا کہ:۔

مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ (یونس ۲)

علامہ اشرف علی تھانوی کا ترجمہ ہے:۔

"مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی طرف سے اس میں کوئی ترمیم کر دوں"

تاریخی حیثیت سے بھی ثابت ہے کہ آپ نے "حجۃ الوداع" کے موقع پر مجمع عام میں جس میں حاضرین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی، فرمایا تھا کہ "اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ" کیوں لوگو! کیا میں نے خدا کے سارے پیغامات

گنجایش نہ تھی اس لئے سہارا اس حدیث سے لیا گیا :۔

"حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور سے دو برتن لے کر یاد رکھے ۔ ایک کو تو میں کھول چکا ۔ رہا دوسرا سو اگر اس کو بیان کردوں تو میرا یہ حلق کاٹ دیا جائے ۔

(بخاری جلد اول باب کتاب العلم صفحہ ۲۴)

یہ روایت اُن حضرات صحابہ کرام کی نہیں ہے جو شروع سے رسول اللہ کے ہمرکاب اور ہم نوالہ اور آرام و تکلیف کے ساتھی رہے ہیں ۔ بلکہ جناب ابوہریرہ کی ہے جو ۷ھ میں ، فتح خیبر کے بعد ایمان لائے تھے اور مشکل سے پانچ سال رسول اللہ کے ساتھی رہے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے ابوہریرہ کو ایک ایسی پوشیدہ بات بتائی جس کو انھوں نے نہ تو صحابہ کرام کو بتایا تھا نہ ازواج مطہرات کو اور نہ اپنے خاندان کے کسی فرد کو ۔ بس خدا سے حاصل کیا اور چپکے سے ابوہریرہ کے کان میں کہدیا اور پھر یہ کان میں کہنے کی رسم آج تک جاری ہے ۔ قرآن کی روشنی میں یہ خیال اور یہ عقیدہ باطل ٹھہرتا ہے ۔ آنحضرت صلعم ساری دنیا والوں کے لئے یکساں "رسول" بن کر تشریف لائے تھے اور خدا کا پیغام اس کے تمام بندوں کے لئے ہمیشہ عام رہا ہے ۔ کوئی وجہ نہیں کہ خدا کی بعض بات آنحضرت ابوبکر دوست اور علی داماد سے تو چھپائے رہیں ۔ مگر جب آخر وقت میں ابوہریرہ اسلام قبول کر کے سامنے آویں تو اُن کے کان میں پھونک دیں ۔ اللہ تعالےٰ نے ہر جگہ رسول اللہ کو "مبلّغ مبین" بتایا ہے یعنی صاف

جن سے قوت ارادی میں اضافہ ہو جائے۔ اس کا نام رکھ لیا گیا "تزکیۂ نفس" اور یہ کہکر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ یُزَکِّیہِمْ سے یہی مفہوم مراد ہے۔ لہذا یہ قرآن و سنت کا اتباع ہے لیکن "قوت ارادی" کا نام "تزکیۂ نفس" رکھ لینے سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی اور نہ یہ قرآن کا حکم تھا نہ سنت"

لہذا "تزکیہ" سے مراد ہرگز "تزکیۂ نفس" نہیں یعنی وہ باطنی تعلیم نہیں جو پُراسرار طریقے پر خانقاہوں میں دیجاتی ہے۔

"تزکیہ" کے معنی صرف پاکی لے کر ملّاؤں نے "تزکیہ" سے مراد صرف "زکوٰۃ" لے لی۔ اور ثبوت یوں فراہم کیا گیا۔

(۱) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (شمس ۱) "مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک صاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اسکو میلا اور گندہ کیا"

(۲) قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ ۱) "مراد پایا وہ جو پاک و صاف ہوا"[1]

یہ پاکی اور صفائی ہوتی کس طرح ہے۔ اس کو یوں ثابت کیا جاتا ہے۔۔

---

[1] ان دونوں آیتوں اور اگلی آیت (توبہ ۱۰۳) کا وہ ترجمہ یہاں درج کیا گیا ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبی" جلد پنجم میں "تزکیہ" کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے۔

تم کو پہنچا نہیں دیئے ؟ اور پھر مجمع سے اثبات میں جواب پاکر آپ نے تین بار آسمان کی طرف انگلی اٹھا کے فرمایا :-

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اے اللہ تو گواہ رہنا

کسی روایت میں بھی یہ نہیں ہے کہ آپ نے اُس دن کسی شخص کے کان میں بھی کچھ کہا تھا۔ پھر حضرت ابوہریرہ نے کیا خاص چیز رسول اللہ سے پائی جو اُن سے صرف خانقاہوں کے سجّادہ نشینوں میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے؟ لہٰذا یہ "تزکیۂ نفس" سے مراد ہرگز وہ باطنی تعلیم اور وہ اسرار معرفت نہیں جس کی پُراسرار طریقہ پر خانقاہوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ قرآن میں کسی جگہ بھی "تزکیہ" کا لفظ "باطنی تعلیم" کے لئے نہیں آیا ہے۔ بقول علامہ پرویز :-

"اُن تمام مقامات پر غائر نگاہ ڈالئے جس میں "تزکیہ" کا ذکر ہے اور پھر بتائیے کہ کہیں کوئی راز اور معرفت کی بات ہے! کوئی ایسا عمل ہے جسے کھلے بندوں بیان نہ کیا جائے بلکہ چپکے چپکے کان میں کہدیا جائے ؟ کوئی ایسا پوشیدہ راستہ ہے جسے ہر شخص کو نہ بتایا جائے ؟ کوئی ایسا مخفی برتن ہے جسے اگر لوگوں کے سامنے کھول دیا جائے تو وہ گلا کاٹ دیں ! کوئی ایسا چور دروازہ ہے جس کا صرف پردگیان راز ہی کو علم ہو کوئی ایسی باطنی تعلیم ہے جو صرف خواص تک ہی محدود ہو ؟ لوگوں نے "تزکیہ نفس" کے لئے یونانی درسگاہوں اور ایرانی آتشکدوں کا رُخ کیا اور وہاں سے ایسی ریاضتیں اور چلّے مستعار لئے

ہوئے ہیں زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے :۔

اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (توبہ ۵)	"مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں۔ جس دن اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔"

یہ ایک آیت کا پہلا ٹکڑہ ہے جس سے سال میں ایک بار زکوٰۃ دے کر "تزکیہ" کرنے یا پانے کی دلیل بہم پہنچائی گئی ہے۔ آیت کا باقی حصہ چھوڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس میں جہاد کا ذکر آجاتا تھا اور پھر یہ آیت زکوٰۃ پر چسپ نہ ہو سکتی تھی۔ آیت کا باقی حصہ مع ترجمہ علامہ اشرف علی تھانوی (جو سید صاحب کے پیر میاں ہیں) یہ ہے :۔

مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ فَلَا تَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (توبہ ۵)	"چار خاص مہینے ادب کے ہیں۔ یہی دین مستقیم ہیں۔ سو تم ان سب مہینوں کے بارے میں اپنا نقصان مت کرنا اور ان مشرکین سے سب سے لڑنا جیسا کہ وہ تم سب سے لڑتے ہیں اور یہ جان رکھو کہ اللہ متقیوں کا ساتھی ہے۔"

غور فرمائیے کہ نہ زکوٰۃ کا ذکر ہے نہ سال میں ایک بار ۲½ فیصدی زکوٰۃ دے کر تزکیہ کرا لینے کا۔ مگر فرمایا جا رہا ہے کہ :۔

"اس کا کھلا ہوا اشارہ سورہ توبہ میں موجود ہے۔"

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (توبہ ۱۳)

"ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر اُن کو پاک وصاف بنا"

علامہ سید سلیمان ندوی صاحب فرماتے ہیں:-

"یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے اُن تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے یَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ وجمعہ) "وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر اُن کو سناتا ہے اور اُن کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے"۔ (سیرۃ النبی جلد پنجم عنوان زکوٰۃ)

گویا رسول اللہ کا مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کر لینا "تزکیہ" ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس "تزکیہ" کا (Rate) یعنی زکوٰۃ کی ۲½ فیصدی شرح بھی قرآن میں تلاش کر لی ہے اور ثبوت میں یہ دو آیتیں پیش کی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"شریعت محمدی نے بھی اس بارے میں اسی طبعی اُصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی پر ایک دفعہ اُس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا اشارہ سورۂ توبہ میں موجود ہے جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان

اسی طرح کا ٹیکس جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ بس اس کی ادائیگی کا یہ طریقہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے بلکہ یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعے ہر شخص سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرے۔ پھر ضروریات وقت کے مطابق جس مصرف کو مقدم دیکھے اس میں خرچ کرے۔" (صفحہ ۱۳۲)

اس کے بعد وہ آنسو بہاتے ہیں کہ :-

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے کوئی خاص اسلامی عمل ہی ترک نہیں کیا ہے بلکہ اُن کی پوری زندگی غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ اُن کی فکری حالت غیر اسلامی ہے۔ اُن کی عملی رفتار غیر اسلامی ہے۔ اُن کا دینی زاویہ نگاہ غیر اسلامی ہو گیا ہے۔" (صفحہ ۱۳۵)

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ "تزکیہ" سے مراد زکوٰۃ دینا ہے۔ سورہ بقرہ کے تیسویں رکوع میں "طلاق" اور "عدت" کے احکام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ :-

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ "اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے (بقرہ ۳۰) تزکیہ و طہارت کا موجب ہے"

عام معاشرتی آداب و اطوار کے بیان کے بعد ہے کہ :-

علامہ موصوف نے دوسری دلیل یہ پیش کی ہے :-

"ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے چنانچہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے :-

اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ	"جو لوگ اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں
دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ فِیْٓ	اور جن کے مالوں میں مانگنے
اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ	اور محروم کا معلوم حصہ ہے"
لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔	

(معارج ۱)

اس آیت سے صاف وصریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین مقرر معلوم اور عملاً رائج ہے "

کیا مقرر؟ کہاں متعین ہے اور کیسے رائج ہے ؟ قرآن میں تو کہیں ذکر نہیں اور نہ اسلام سے پہلے ۲½ فیصدی زکوٰۃ جاری تھی جس کی طرف اشارہ ہے ؟ بہرکیف! یہ ندوی صاحب فرماتے ہیں اور علامہ ابوالکلام آزاد نے "ترجمان القرآن" جلد دوم میں فرمایا ہے کہ :-

"قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کردیا ہے اور اسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد ومصالح کا حصول موقوف ہے ۔ زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے بالکل

سمجھ کر زمین میں دبا دیتے۔ دفن کر دیتے تھے۔ اس مٹی میں دبا دینے کو قرآن نے "تدسیہ" کہا ہے۔

أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ (نحل) "آیا اس ذلت کو لئے رہے یا اس کو مٹی میں دبا دیے؟"

اس لئے "تزکیہ" کے معنی ہیں نفس انسانی میں ارتقا اور بالیدگی پیدا کرنا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب احکام قرآنی، فطرت کی آواز بن کر عمق قلب سے اُبھریں "عمل" کا جذبہ محرکہ قوت ارادی ہے اور قوت ارادی کے منبع و مخرج کو قلب کہا جاتا ہے۔ دنیا میں جسے نیکی کہا جاتا ہے وہ دراصل کوئی چیز نہیں۔ بلکہ نیک ارادے کے صرف مظاہرہ کا نام ہے بقول کانٹ (KANT):-

"بجز ارادے کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا سے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں جس کو علی الاطلاق، بغیر کسی قید اور شرط کے اچھا کہا جا سکے۔"

یا بقول میکنزی (Mackenzie):-

"جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں۔"

سرور کائنات نے ایک ایسا جماعتی نظام قائم کیا تھا جس میں احکام قرآن پر اس نہج و انداز سے عمل ہوتا تھا۔ کہ ان کے اعمال کے درخشندے نتائج واضح اور بین طور پر سامنے آجاتے تھے جس سے یہ حقیقت بے نقاب

هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ (نور ۲۸) "یہ امر تمہارے لئے موجب "تزکیہ" ہے۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "تزکیہ" کا مطلب صرف ادائے زکوٰۃ نہیں۔

بقول صاحب "معارف القرآن" تزکیہ کے معنی بڑھنا۔ پھولنا اور نشوونما کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ انسان کی اندرونی استعداد کو اجاگر کرنا، اُس کے جوہرِ خوابیدہ کو بیدار کرنا، بالیدگی کی صلاحیت کو پیدا کرنا، اوپر اٹھانا اور آگے بڑھانا ہے۔ ایک پودے کو کیسے نشوونما دیتے ہیں؟ اس طرح کہ اس کے لئے مساعد ماحول مہیا کیا جائے۔ جو چیزیں اس کی بالیدگی میں ممد و معاون ہو سکتی ہیں۔ انھیں مہیا کیا جائے اور اُن موانع کو دور کیا جائے جو اس کی بالیدگی کی راہ میں حائل ہوں۔ اس طرح اس بیج کے اندر جس قدر صلاحیتیں موجود ہیں اُنہیں ابھارنے کا موقع مل جائے گا اور وہی ننھا سا بیج ایک تناور درخت بن جائے گا۔ نفس انسانی کی نمو و بالیدگی یعنی تزکیہ کے لئے بھی ضروری ہے کہ اُسے صحیح تعلیم دی جائے اور اُن تمام موانع کو دور کر دیا جائے جو اُسے ابھرنے سے روکتے ہیں۔ یہی "تزکیہ" ہے

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ — "بیشک وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کا تزکیہ کیا
قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — اسکو نشوونما دیا اور بیشک وہ نامراد ہوا جس نے
(شمس ۱) — اُس کو دبا دیا۔"

یہاں "تزکیہ" کے مقابلے میں "تدسیہ" آیا ہے۔ "تدسیہ" کے معنی کسی چیز کو دبا دینے کے ہیں۔ عرب ایام جاہلیت میں اپنی بیٹیوں کو شرمناک

انسانیت کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ فساد ہوگا۔ بہترین دساتیر وقوانین بھی اطمینان بخش نتائج مرتب نہیں کر سکتے جب تک اُن قوانین کو نافذ کرنے والی جماعت اور اُن پر عمل کرنے والی قوم کے قلب و نگاہ کی اصلاح نہ ہو چکی ہو۔ تہذیب مغرب کی جہاں سوزی اور بالآخر خودکشی کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس نے انسان کو ایک مشین سمجھ لیا ہے جسے جس وقت حسابی قاعدے کے مطابق چلایا جائے تو اس سے متعینہ نتائج ازخود مرتب ہوتے چلے جائیں۔ حالانکہ صاحب اختیار وارادہ انسان اور بلا اختیار وارادہ مشین میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو انھوں نے کہدیا کہ جب ذہن انسانی کسی قانون اور ضابطہ کے اساس واصول اور متعلقات وتضمینات پر غور کرکے اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ وہ قانون اچھا اور وہ ضابطہ عمدہ ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان قانون پر عمل پیرا نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ ادعائے علم ودانش وہ اتنا نہیں سمجھ سکے کہ عمل کا محرک جذبۂ قوت ارادی ہے اور قوت ارادی کا تعلق "دل" سے ہے "دماغ" سے نہیں۔ اس لئے تنہا علم، عمل کا محرک نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے یہ بھی کر لیا، کہ اپنی قوم کو سمجھا دیا کہ ان آئین وضوابط کی پابندی سے اُنھیں فلاں فلاں مفاد حاصل ہوں گے۔ اس ترغیب وتحریص سے افراد قوم نے اُن آئین وضوابط پر عمل کیا۔ لیکن چونکہ قوم اُن قوانین وضوابط کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس نہیں کرتی تھی۔ اس لئے اُن کا یہ عمل سرتاسر منافقت تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ منافقت کے جراثیم ایسے ہیں جو دق کے

ہو جاتی تھی کہ یہ احکام زندہ حقائق ہیں، مُردہ رسوم نہیں۔ علم تجزیہ نفس کا امام فرائیڈ (FRIDE) مغرب کی سوسائٹی پر ہنستے ہوئے اس نکتے کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے :-

"وہ مہذب سوسائٹی جو افراد سے اچھے کردار کا تو مطالبہ کرتی ہے لیکن جن محرکات پر اس کردار کی بنیاد ہوتی ہے۔ اُن کا کچھ خیال نہیں کرتی، وہ ایسے افراد سے اطاعت احکام کراتی ہے جو اس اطاعت میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی اطاعت نہیں کر رہے ہوتے۔ جس شخص سے ایسے احکام کی اطاعت کرائی جائے جنھیں وہ اپنے فطری تقاضوں کا مظاہرہ نہ سمجھے، علم النفس کی زبان میں یوں سمجھئے کہ ایسا شخص اپنے ذرائع اور وسائل کی حدود سے باہر زندگی بسر کر رہا ہے اور ایسے شخص کو منافق کہتے ہیں خواہ اُسے اس کا احساس ہو یا نہ ہو۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ہماری دور حاضرہ کی تہذیب کی فضا ایسے منافقین کی تخلیق کے لئے غیر معمولی طور پر سازگار ہے"

نبی اکرم اس نکتے سے واقف تھے اور جس انداز سے وہ قرآنی احکام پر لوگوں کو عمل پیرا بناتے تھے۔ اس سے اعمال کے نتائج نکھر کر سامنے آجاتے تھے۔ اور اُن محسوس نتائج سے روح میں بالیدگی، اور قلب میں کشادگی پیدا ہوتی تھی۔ اس کا نام "تزکیہ" تھا۔ بقول موصوف جس سوسائٹی کے نظام کی بنیاد تزکیۂ قلب و تطہیر فکر پر نہیں ہے وہ نظام کبھی بھی نشوونما

کے دیئے جو فرائض عائد کئے گئے تھے وہ یہ نہ تھے کہ قوم کو، مال لے کر محتاج بنا دیں یا بے عمل و بیکار بنا کے مسجد و خانقاہ کی چٹائیوں پر سُلا دیں بلکہ یہ فرض قرار پایا تھا کہ انھیں ہر طریقہ سے ایسی پاکیزہ و مطہر قوم بنا دیں جس کا نفس آئینہ بن گیا ہو۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور جب قوم کی قوم کا یہ حال ہو چکا ہو تو پھر وہ جو کچھ دنیا میں کر سکتی ہے وہ مخفی نہیں۔ ہزار برس پہلے کی تاریخ سامنے ہے۔ ورق الٹ کر دیکھ لیجئے غیروں سے سُن لیجئے:۔

(۱) "ہم میں سے اُن لوگوں کے لئے جن کے نزدیک "انسان" ہی سب کچھ ہے اور "ماحول" کچھ نہیں۔ محمدؐ، اس حقیقت کی عظیم الشان مثال ہے کہ ایک انسان کیا کچھ کر سکتا ہے؟ لیکن وہ لوگ بھی جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ تاریخ کے انقلابات کسی ایک فرد کی کوششوں سے کہیں زیادہ ماحول کی خصوصیات اور قلب انسانی کی استعداد قبولیت کے رہین منت ہیں۔ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ اگر تاریخ میں ایسا انقلاب آنا ہی تھا جو عرب میں آیا تو محمدؐ کے بغیر یہ انقلاب ایک غیر معین عرصہ تک معرض التوا میں رہتا۔"

(۲) "اس حقیقت کبریٰ کو جتنی مرتبہ دہرایئے کم ہے کہ محمدؐ نہ صرف ایک ایسے عظیم القدر مذہب کا پیغمبر تھا۔ جس نے اس دنیا کی روحانی تسکین کا سامان فراہم کیا جو خالص توحید کے لئے پیاسی تھی بلکہ وہ ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی

بخار کی طرح جوہر انسانیت کو آتش خاموش کی طرح اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتے ہیں قرآن اس قسم کی سوسائٹی کی تشکیل کرتا ہے جو اطاعت احکام میں اپنی فطرت کے تقاضوں کی تسکین محسوس کرے۔ قلب کی اسی کیفیت کا نام "تزکیہ" ہے جب قرآن قلب کی گہرائیوں میں اتر جائے تو انسانی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور داخلی دُنیا کی اس تبدیلی سے خارجی دنیا میں انقلاب عظیم آجاتا ہے۔ کیونکہ خارجی تبدیلی درحقیقت داخلی تبدیلی کے مظاہرہ کا نام ہے۔ قرآن یہی انقلاب پیدا کرتا ہے :۔

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود (اقبال)

چونکہ اس نوعیت کی اطاعت میں فطرت اپنے تقاضوں کی تسکین و طمانیت کا سامان پاتی ہے۔ اس لئے اس سے اس میں بالیدگی اور نشو و ارتقار پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں بڑھتی چلی جاتی ہے۔

تو یہ ہے "تزکیہ" مگر عجمی تصورات نے جہاں اور قرآنی الفاظ، اعمال اور افکار پر نگہ فریب پردے ڈالے ہیں وہاں "تزکیہ" کی حیثیت کو بھی ایسی پرفانی سلوں کے نیچے دبا دیا ہے جس سے زندگی کی گرمیاں، جمود و تعطل کی افسردگیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اب ہمارا اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ اور بہتر سے بہتر دماغ بھی قرآنی الفاظ و افکار پر جو کچھ سوچتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو اس کو کئی سو برس پہلے سمجھایا اور بتایا گیا تھا۔ رسول اللہ

سمجھنا گناہ اور بے ترجمہ قرآن کو نہ سمجھ میں آنے والی کتاب قرار دینا ، کتاب اللہ کو ناقص و نامکمل اور مشکل اور ثقیل صحیفہ خیال کرنا ، اسلام قرار پایا۔ اب عقیدہ یہ ہے کہ قرآن محتاج حدیث ہے ۔ اس کو اُن ہی روایات کی روشنی میں سمجھنا ہوگا جنھیں تیسری صدی ہجری میں چھ عجمیوں نے مرتب کیا ہے اور جو وہ سمجھائیں وہی صحیح ہے چاہے وہ کسی قدر خلاف عقل ہو۔

(۲) تزکیہ کے معنے خالقاہوں کی کوٹھریوں میں دنیا سے منہ موڑ کر بیٹھنے اور دوسروں کی کمائی ہوئی محنت سے فائدہ اٹھانے کے ہیں یا ۲½ فیصدی زکوٰۃ ادا کر دینے کا نام تزکیہ ہے ۔ بس اب آپ پاک ہو گئے ۔ جنّت رکھی ہوئی ہے ۔

(۳) کتاب و حکمت کا مطلب قرآن و حدیث ہے ۔ کتاب وہ جو ادق ، مشکل ، ناقص اور محتاج ہے اور حدیث وہ جو شیعوں کی الگ اور سُنّیوں کی علیحدہ ہے اور تیسری و چوتھی صدی ہجری میں سب کے سب عجمیوں نے سنی سُنائی باتوں کو "صحیح" قرار دے کر کتابوں میں مدوّن کر دیا ہے اور جو بتاتی ہے کہ رسول اللہ نے اپنی قوم اور اُمت میں بہتّر فرقے ہونے کی پیشین گوئی کر دی ہے ۔ اس لئے کوئی اپنے کو "مسلمان" نہ کہے بلکہ اپنی ٹولی کی نسبت سے اپنا مسلک ظاہر کرے

اب بتائیے کہ اقبال نے جو یہ کہا ہے تو کیا غلط کہا ہے ؟ :-

انقلاب کا معلن تھا جس کی نظیر تاریخ نے تو کبھی دیکھی نہیں تھی۔"

(۳) انسان کے تمام فرائض حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے "اسلام" یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیت ایزدی کے تابع کر دینا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے یکسر مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح یہ مسلک ایسا ہے جس میں ایک مسلم بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی دونوں بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدان جنگ میں جانے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ لیکن صرف اس جنگ کے لئے جو دنیا سے شر کے استیصال کے لئے کی جائے۔"

اب پھر وہ آیت سامنے لائیے جس میں رسول اللہ کے تین فرائض گنائے گئے تھے:۔

(۱) يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

(۲) وَيُزَكِّيْهِمْ

(۳) وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

غور کیجئے کس طرح ان الفاظ کی مٹی پلید کر دی گئی:۔

(۱) قرآن کا بے سمجھے محض ثواب کے لئے پڑھنا، اس کو ترجموں سے

"مقابلہ"

"عمل" سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ بندہ اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے (اقبال)

یہاں "مقابلہ" سے میرا مقصود اس طرح کے مقابلہ کا ذکر نہیں جس طرح کے "مقابلہ" کا حال علامہ ابوالکلام آزاد نے "غبار خاطر" میں کیا ہے:۔

"اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامع ازہر کے علماء کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ علماء نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ "جامع ازہر" میں "صحیح بخاری" کا "ختم" شروع کر دینا چاہیئے اس لئے کہ "انجاح مقاصد کے لئے تیر بہدف ہے"! چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ابھی "صحیح بخاری" کا "ختم" ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ شیخ عبدالرحمن الجبرتی نے اس عہد کے چشم دید حالات قلم بند کئے ہیں جو بڑے ہی عبرت انگیز ہیں۔"

اور نہ میں اس "مقابلہ" کو پیش کرنا چاہتا ہوں جو ابھی بیسویں صدی میں سرزمین

زمن برصوفی و ملّا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت
خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

(اقبال)

کا اندازہ اس امر سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ وہ مصر کی فوجوں کو
گھسیٹتے ہوئے ۴۰ میل مصر کے اندر گھس گئی تھی۔ اس صورت
حال کے باوجود دنیا بھر کے مسلمان اس موہوم امید پر جی رہے
ہیں کہ اسرائیلی ریاست بہت جلد فنا ہو جائے گی اور پھر عربوں
کو اقتدار نصیب ہوگا۔" (مدینہ بجنور مورخہ ۲۱ جنوری ۱۹۵۰ء)

بلکہ میرا مقصد دوسری طرح سے ایک مقابلہ ہے۔

اس وقت بھی مسلمانوں کا مرکز بدستور "مکہ" ہے جہاں خدا کا گھر کعبہ واقع ہے اور غیر مسلموں یا یوں کہیے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ "امریکہ" ہے۔ "مکہ" کو مسلمانوں کا مرکز یکم جنوری ۶۳۰ء (۱۰ رمضان ۸ھ) سے قرار دینا چاہیئے جس دن مکہ فتح ہوا اور امریکہ کو غیر مسلموں کا مرکز ۱۲ اکتوبر ۱۴۹۲ء سے سمجھنا چاہیئے۔ یعنی جس روز کولمبس پہلے پہل اس سرزمین پر اترا تھا۔ مگر نہیں شاید یہ زیادہ عرصہ مقابلہ کے لئے مناسب نہ ہو۔ لہٰذا آیئے ہم دونوں مرکزوں کا وجود ۱۹۱۰ء / ۱۳۱۹ھ سے قرار دیں۔ یعنی جس سال سلطان ابن سعود موجودہ فرمانروائے حجاز نے مکہ پر قبضہ کر کے مکمل امن و امان قائم کیا تھا اور جس سال امریکہ میں بھی امریکہ کے چھبیسویں صدر روز ولٹ نے خانہ جنگی ختم کر کے فضا کو پرسکون بنا دیا تھا۔ اس پچاس سال

لہ مکہ کے جواب میں تو واشنگٹن یا امریکہ کے بالمقابل حجاز لانا چاہئے تھا کہ جو کچھ میں مقابلہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے موجودہ شکل اختیار کرنا ناگزیر تھا۔

فلسطین پر ہوا :-

(۱) "۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کی رات کو ۱۲ بجے برطانوی انتداب کے خاتمہ کا اعلان ہوا۔ یہ انتداب ۲۴ سال ۷ ماہ اور ۱۴ دن پہلے ارض مقدس میں قائم ہوا تھا۔ انتداب کے خاتمے سے آٹھ گھنٹے قبل ہی پہلے سے تیار کی ہوئی سازش کے مطابق یہودیوں کی طرف سے حکومت اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کو ابھی دو منٹ گذرے تھے کہ امریکہ جیسی بڑی طاقت نے خلاف دستور اس مفروضہ اسرائیلی ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۱۶ مئی کو یہودیوں نے علا الاعلان عرب حکومتوں سے جنگ شروع کر دی!"

(رسالہ "ندائے حرم" (کراچی) مارچ ۱۹۵۰ء)

(۲) "مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کی حالت کا اندازہ اسی بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک راندۂ درگاہ قوم کو محض ہماری بداعمالیوں اور اخلاقی گمراہیوں کی وجہ سے عالم اسلام کے قلب میں پیر جمانے کی جگہ مل گئی اور سارے مسلمان ملکوں کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود دنیا کے نقشہ پر ہی نہیں بلکہ ہمارے سینے پر مضبوط یہودی ریاست قائم ہو گئی جو مادی، فوجی اور اقتصادی لحاظ سے تمام عرب ریاستوں سے زیادہ قوی اور طاقتور ہے۔ اس کی فوجی برتری

میں ۳۷ فیصدی کا اضافہ ہوگیا ہے"۔

"مسٹر اویری کا خود بیان ہے کہ گذشتہ پچیس سال کے اندر امریکہ نے جس قدر ترقی کی ہے۔ اس کی مثال کسی زمانہ کی تاریخ سے نہیں ملتی۔ اس مختصر مدت میں امریکہ کی ثروت، چہار چند ہوگئی ہے اور صنعتوں نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ امریکہ کی مشہور صنعتیں۔ موٹر، سینما، لاسلکی، ٹیلیفون اور کیمیائی مواد ہیں... اس کے کارخانوں نے ۱۹۲۴ء میں ۲۰ ملین ڈالر صرف اشہار میں صرف کئے"۔

"امریکہ اس وقت دنیا کا غنی ترین ملک ہے اور وہاں کا ہر طبقہ خوشحال ہے مسرت و افلاس کا پتہ نہیں۔ لوگ محنت کرتے ہیں

"ریاض اور کویت کی درمیانی منزلوں کی طرح، یہاں بھی بدوؤں کے لڑکے روٹی کے ٹکڑوں کی تلاش میں ہر طرف ہاتھ پھیلائے نظر آتے ہیں، اللہ اللہ! جن کے آبا و اجداد نے اونٹ کا دودھ پی پی کر ایک اُمّی کے طفیل، کسریٰ اور قیصر کی حکومتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھدی تھی، آج وہ پھر اسی جہالت اور فقر و بیکسی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد ایک ایک ڈنر پر دس دس ہزار پونڈ صرف کریں اور بدوؤں کے بچے روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترسیں؟ اگر اسلامی حکومت اسی کا نام ہے تو اسلام اور مسلمان دونوں پر فاتحہ پڑھ لینا چاہیئے"۔

(علامہ مسعود عالم ندوی ۱۹۴۹ء)

کی مدت میں دونوں جگہ کیا کیا کچھ ہوا۔ اس سے بحث نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ اس وقت ان دونوں مسلموں اور غیر مسلموں کے مراکز کی مقابلتاً صورت حال یوں ہے:۔

(امریکہ)

"امریکہ کی دولت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جس طرح دوسرے ملکوں میں اکھ پتی بڑی چیز سمجھا جاتا ہے، وہاں ارب پتی ہے۔ لاکھ اور کروڑ کا تو وہاں کوئی ذکر ہی نہیں کرتا۔ جب بات ہوتی ہے تو ارب سے ابتدا ہونا معمولی گفتگو ہے۔ گذشتہ ۱۵ سال کے اندر ساری دنیا نے جس قدر ترقی کی ہے اس کا اندازہ ایک لاکھ ملین ڈالر ہے۔ لیکن صرف امریکہ نے اور وہ بھی ۲۵ سال کے اندر جو ترقی کی ہے اس کا اندازہ دو لاکھ پچاس ہزار ملین ڈالر ہے۔ گیہوں کی پیداوار میں ۶۰ فیصدی، روئی میں ۵۰ فیصدی اور مویشیوں

(مکہ)

"اہل حرمین کی ناداری و تنگدستی از حد افسوسناک ہے۔ جو کبھی اشرفیاں بھناتے تھے۔ وہ پیسے جمع کرتے ہیں۔ روپیوں کو ترستے ہیں پچھلی داد و دہش کا نام و نشان نہیں۔ ذریعۂ معاش بھی نہیں۔ جو تھے وہ بھی سٹ گئے۔ بس حاجیوں کی خرخیرات۔ سو اُن کے بھی اخراجات بڑھ گئے۔ گنجایش گھٹ گئی۔ گزر ہو تو کیونکر ہو، حیرانی ہے۔ پریشانی ہے، سرگردانی ہے۔ کچھ اندوختوں پر بسر کرتے ہیں۔ کچھ ساز و سامان بیچ کر کام چلاتے ہیں اور کچھ مجبور ہو کر دست سوال پھیلاتے ہیں"!

(پروفیسر برنی ۱۹۳۳ء)

مالی حالت لازمی قرار دے دی گئی۔"

(۳) "شکاگو شمالی امریکہ کے وسط کا وہ علاقہ ہے جہاں باجرہ کثرت سے پیدا ہوتا ہے جس کی بڑ سؤر کی مرغوب غذا ہے۔ لہٰذا حکومت نے اخراجات بچانے نیز اس علاقہ کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے اسی علاقہ میں سؤر پالنے کا انتظام کیا ہے اور مختلف کارخانے قائم کئے ہیں جن میں الگ الگ کام ہوتا ہے۔ کہیں اس کے خون سے کھاد تیار کی جاتی ہے۔ کہیں اُس کے اُون کے سامان بنتے ہیں۔ کہیں اس کے چمڑے کی چیزیں تیار ہوتی ہیں کہیں ہڈیوں سے مختلف قسم کے مصرف لینے کی مشینری قائم ہے۔ کہیں اس کا گوشت مختلف سائنٹیفک طریقے پر اور اس کا بڑا حصہ شاہی حق متصور ہوتا ہے۔ آمدنی ناکافی ہے۔ نتیجہ یہ کہ رعایا کو . . . . بہت تھوڑا حصہ ملتا ہے۔ معاش کی تنگی ہے۔ البتہ شاہی خزانہ اشرفیوں سے معمور بیان کیا جاتا ہے۔"

(۲) "حجاز کی موجودہ تجارت خارجہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے۔ یعنی مال درآمد ہوتا ہے۔ برآمد نہیں ہوتا۔ اور درآمد کی قیمت بشکل زر ادا ہوتی ہے۔ اہل فن بخوبی واقف ہیں کہ یہ صورت کس درجہ مہلک اور مضرت رساں ہے اور اس کا انجام افلاس و تباہی ہے۔"

(۳) "قربانی کے جانور بکثرت اور سستے ملتے ہیں اس لئے حاجی بڑی فیاضی سے اور بہ کثرت قربانی کرتے ہیں۔ ۱۰، ۱۰۰، ۲۰۰، ۲۰۰ تک مگر وہ جانور حق نہیں لگتے

روپیہ کماتے ہیں اور عیش کرتے ہیں۔ وہاں کاہلی و بیکاری مفقود ہے"
(نیاز فتحپوری ۱۹۳۴ء)

غور فرمایئے۔ مقابلہ کیجئے "مسلمان" خدا کے چہیتے، اللہ کے فرماں بردار صراط مستقیم پر قائم مگر ذلت و خسران اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہیں اور وہ بھی کہاں کے "مکہ" کے۔ مگر غیر مسلم، خدا کے مغضوب، اللہ کے نافرمان، اور باطل پر چلنے والے۔ مگر شاداں و فرحاں اور غنی و مستغنی ہیں اور وہ بھی کہاں کے "امریکہ" کے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا تھوڑا بہت اندازہ یوں کیا جا سکتا ہے:۔

(امریکہ)	(مکہ)
(۱) "سلطنت متحدہ امریکہ کا پچیسواں صدر میک کلنے ہوا تو اس نے عوام کی فلاح اور ملک کی ترقی کے لئے چاندی کے سکے کے بجائے سونے کا سکہ تسلیم کیا اور ڈالر جاری کئے گئے"	(۱) "حجاز میں فی الحال حکومت کی آمدنی کا ایک حصہ خود لے لیتی ہے اور رعایا کو بہت تھوڑا حصہ ملتا ہے حجاج کے اخراجات جس طرح سرکاری طور پر متعین ہیں ..... وہ آمدنی بھی سرکاری خزانہ میں نہیں جاتی کہ ملک کی ترقی پر بھی صرف ہو بلکہ بیشتر حصہ جلالۃ الملک کے ذاتی شاہی خزانہ میں جمع ہوتا ہے۔ حجاج کی آمدنی کا بڑا حصہ کوئلہ" ہے
(۲) چھبیسواں صدر روزولٹ (۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک) کے دور میں قانون جلاوطنی پاس کیا گیا جس سے امریکہ میں آباد ہونے والے کے لئے ..... مناسب	

اٹھا رہے ہیں اور اس کی کوئی چیز برباد جانے نہیں دیتے بلکہ اس کو نعمت سمجھ کر اس کا زیادہ سے زیادہ مصرف لے رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ موجودات کی تخلیق لایعنی نہیں ہے۔ یہاں کوئی چیز بیکار محض نہیں ہے بلکہ کائنات کی ساری چیزیں کسی نہ کسی مقصد کے نزدیک تخلیق ہوئی ہیں۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (دخان ۲)

"ہم نے ارض و سمٰوٰت کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے محض کھیل تماشے کے لئے پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان کو حق کے ساتھ (ایک مثبت تعمیری مقصد کیلئے) پیدا کیا ہے لیکن بیشتر انسان یہ نہیں سمجھتے۔"

مگر اہل مکہ اپنی پاک و مقدس قربانیوں کے جانور کو بھی ذبح کر کے مٹی میں ملا دیتے ہیں اور قرآن کو جس کے اولین مخاطب وہی تھے نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ قرآن چیخ رہا ہے کہ:

(۱) اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً (نحل ۶)

"بلاشبہ تمہارے لئے مویشیوں میں غور کرنے کا ہے۔"

(۲) وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (نحل ۱)

"اللہ نے چوپائے بنائے۔ اس میں تمہارے لئے جاڑے کا سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور ان میں سے کھاتے بھی ہو۔"

(۳) وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا

"اور تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں کے گھر بنائے جنکو تم کوچ کے دن اور قیام کے

سکھا کے اور ٹین میں بند کر کے امریکہ اور باہر کے ملکوں میں بھیجنے کا انتظام ہوتا ہے۔"

سب تو خود ہی قربانی کرتے ہیں۔ کون دوسرے کا کھائے؟ بدّو گوشت پر پیسوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا تقریباً سب کے سب جانور یا الحموم گڑھوں میں دفن کر دیئے جاتے ہیں۔"

غور فرمائیے دونوں جگہوں میں جانور کے مصرف پر۔ گویا:۔

یہاں امریکہ میں، حرام جانوروں کی صرف وہ چیز برباد جاتی ہے جو وہ مرنے کے وقت بلند کرتا ہے۔ باقی سب کچھ مصرف میں لایا جاتا ہے۔

یہاں مکہ میں حلال جانوروں کی صرف وہ چیز مبارک اور بکار آمد سمجھی جاتی ہے جو وہ قربانی کے وقت بلند کرتا ہے۔ باقی سب کچھ برباد کر دیا جاتا ہے۔

بہ بیں تفاوت رہ، از کجاست تا بہ کجا؟

بھلا جب یہ صورت حال ہو تو امریکہ والے نہ فلاح و بہبود حاصل کرینگے تو کیا مکہ والے؟

اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی (نجم ۳)

"انسان کو اتنا ہی ملے گا جتنا بھروہ محنت کرے گا اور انسان کی تو بس محنت ہی دیکھی جائے گی۔"

امریکہ والے والے ناپاک اور حرام سؤر کی ہر ہر چیز سے فائدہ

افسوس ہے کہ بیشتر سامان بدیسی بالخصوص یورپی ہوتا ہے
یہ سب سامان کہاں سے آتا ہے اور اُن کی قیمت کہاں
جاتی ہے؟ سب کو معلوم ہے۔ امریکہ اور یورپ مالا مال
ہو رہا ہے۔ حجاز میں اُن کا بازار جم رہا ہے۔ حجازیوں کو
کیا ملتا ہے؟ چند فیصدی کمیشن! باقی لاکھوں روپیہ کی رقم
ہر سال غیر ممالک کو چلی جاتی ہے۔"

بچارے نے مشورہ بھی دیا کہ:-

"حجاز میں دنبوں اور بکروں کی بہت کثرت ہے۔ ہر سال حج
کے موقع پر لاکھوں قربان ہوتے ہیں۔ اُن کی کھالیں دھونے
اور رنگنے کا اہتمام کیا جائے تو دباغت کا بہت بڑا کارخانہ
قائم ہو سکتا ہے اور ببول جو اس صنعت میں بہت درکار ہے
حُسنِ اتفاق سے اس ملک میں کافی ملتا ہے۔ اور اس میں
اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ چمڑہ رنگنے کے بعد چرمی صنعتیں بھی
جاری ہو سکتی ہیں۔ جوتے، ہینڈ بیگ، سوٹ کیس سب
کچھ تیار ہو کر باہر جا سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا حجاز میں اون بہت وافر
اور ارزاں ہے۔ اُون کی صنعت اور تجارت کی بھی بہت
گنجایش ہے۔"

مگر بھلا یہ صدا کون سنتا ہے؟ آخر مسلمان سنیں بھی تو کیونکر، جبکہ انکو تعلیم ہی یہ دیگئی کہ
دنیا کی ساری نعمتیں کافروں کیلئے ہے اور مسلمان کو صرف دین کی فراغت کے خیال پر بھروسہ

يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ إِقَامَتِكُمْ وَمِنْ أَصْوَافِهَا وَأَوْبَارِهَا وَأَشْعَارِهَا أَثَاثًا وَمَتَاعًا إِلَىٰ حِينٍ (نحل ۱۱)

دن ہلکا پاتے ہو اور اُن کے اُون اور اُن کے رُوئیں اور ان کے بالوں سے گھر کے سامان بناتے ہو اور بھی فائدے کی چیزیں بنائیں ایک خاص مدت تک کے لئے۔"

(۴) وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوبُهُمْ وَمِنْهَا يَأْكُلُونَ وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (یٰسین ۵)

"اور ہم نے مویشیوں کو اُن کے تابع کر دیا ہے کہ بعض اُن کی سواریوں میں کام آتے ہیں بعض کھائے جاتے ہیں۔ اور اُن میں اور بھی فائدے ہیں اور پینے میں بھی۔"

(۵) اَللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَنْعَامَ لِتَرْكَبُوا مِنْهَا وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ وَلَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوا عَلَيْهَا حَاجَةً فِي صُدُورِكُمْ (مومن ۹)

"وہ اللہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے مویشی بنائے تاکہ تم اُن سے سواری لو۔ اور اُن میں سے کھاتے بھی رہو اور تمہارے لئے اُن میں اور بھی فائدے ہیں اور تاکہ تم اُن کے ذریعے اُن مطالب تک پہنچو جو تمہارے دلوں میں ہیں۔"

بھلا اب اور کتنی وضاحت سے بتایا اور کہا جائے؟ ہر چیز کی صنعت کی طرف تو اشارہ کیا جا رہا ہے؟ اب کیا اللہ خود اپنے ہاتھوں سے بنا بنا کے مکہ والوں کو دے کہ تم ان کو بیچ بیچ کر اپنا پیٹ پالو! پروفیسر الیاس برنی نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ حجاز میں حج کے موقع پر:-

"لاکھوں روپے کا مال فروخت ہوتا ہے لیکن کس درجہ

"مُسلمان"

چہ گویمت ، زمسلمان ، نامسلمانے
حرم ایں کہ پُر خلیل است آزری داند (اقبال)

فی زمانہ "مُسلمان" اُس کو کہتے ہیں :-

(۱) جو اللہ تعالیٰ کو خالق کائنات کہتا اور مانتا ہو ۔

(۲) جس کا نام عبداللہ ، عمر ، حمزہ ، خالد وغیرہ قسم کا ہو ۔

(۳) جس کا بچپن میں عقیقہ اور ختنہ ہوا ہو اور جب وہ جوان ہو جائے تو اس کے چہرے پر ڈاڑھی نظر آتی ہو ۔

(۴) جو نماز روزہ وغیرہ کے مراسم ادا کر لیتا ہو ۔

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی "اسلام" کا تعلق ان ہی ظواہر سے ہے ؟ اور مُسلمان" اسی کو کہتے ہیں جو ان خصوصیات کا حامل ہو ؟ جواب یہ ہے کہ ـــــ ہرگز نہیں ۔ یہ عقیدہ باطل ، یہ خیال لغو اور یہ تصور سراسر غلط ہے ۔

(۱)

اللہ تعالیٰ کو مالک ارض و سمٰوات اور خالقِ کائنات تو کفار عرب

کرکے یہاں جیسے بھی گذرے اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہیئے ؟ ان بچاروں کو کیا معلوم کہ دنیا ہو یا دین ۔ دونوں جگہ کی خوشحالی و فارغ البالی کا دار مدار صرف "عمل" پر ہے ۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو جتنا بھر جد و جہد سعی و کاوش اور کوشش و محنت کرے گا وہ اتنا ہی بھر فائز المرام ہوگا ۔ لہذا جو قوم یکسر جہد و عمل کا نمونہ بنی ہوئی ہے وہ شاد کام ہے اور جس نے عمل سرے سے ترک کر رکھا ہے وہ نامراد اور ذلیل و بدحال ہے اور جب تک بے عمل رہے گی خاسر و ناکام رہے گی ۔

"مسلمان" کہلانے کے لئے کافی نہیں ہے۔

(۲)

عبداللہ، عمر، حمزہ اور خالد وغیرہ سب "عربی" نام ہیں۔ "اسلامی" نہیں یہ نام جن حضرات کے تھے وہ سب کے سب جب "کافر" تھے جب بھی اُن کے نام یہی تھے اور جب وہ "مسلمان" ہوگئے جب بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور وہی نام بدستور باقی رہے۔ اسلام کا جب پتہ نہ تھا جب بھی ہیسیوں عبداللہ مکہ میں موجود تھے اور سب کے سب کافر۔ پھر عبداللہ عمر، حمزہ اور خالد وغیرہ اسلامی نام کیسے ہوئے اور جن لوگوں کا نام یہ ہو اُن کا نام سنتے ہی اُن کو "مسلمان" کیسے کہا جا سکتا ہے؟۔ خدیجہ، زینب رابعہ وغیرہ بھی آج اسلامی نام سمجھے جاتے ہیں؟ یہ کیونکر؟ یہ نام جن عورتوں کے تھے وہ سب پہلے کافر و مشرک تھیں؟ اسے اسلامی نام کس طرح بتایا اور سمجھا جا سکتا ہے؟ اس سے معلوم ہوا کہ "اسلام" میں نام کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ذرہ برابر بھی اسلام کو "نام" سے تعلق ہوتا تو اُن ایک لاکھ مسلمان اور صحابہ کرام کے نام بدل جاتے جنھوں نے آنحضرت کے سامنے اسلام قبول کیا تھا اور حضرات خلفائے راشدین کا نام بھی بدل جاتا کیونکہ یہ سب نام حالت کفر کے رکھے ہوئے تھے۔ لہٰذا اسلام میں "نام" کی کوئی اہمیت نہیں۔

(۳)

اسلام کا تعلق نہ عقیقہ سے ہے نہ ختنہ سے اور نہ ہی داڑھی سے عقیقہ بقول

اور مشرکین مکہ بھی جانتے تھے اور مانتے تھے:۔

(۱) قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (مومنون ۵)

تم ان سے پوچھو گے یہ زمین اور اس کی ساری چیزیں کس کی ہیں بتاؤ تو اگر جانتے ہو؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ کی ہیں۔ تو پوچھو اس کے باوجود تم لوگ کچھ بھی نہیں سمجھتے؟"

(۲) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ (عنکبوت ۶)

اور اگر تم ان سے دریافت کرو گے کہ وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے۔ تو پھر وہ کدھر جا رہے ہیں؟"

اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفار و مشرکین عرب قائل تھے کہ اللہ ہے اور وہ خالق کائنات بھی ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ جب وہ زبان سے اللہ کے قائل ہی تھے تو آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ اور فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ سے ظاہر ہے کہ وہ زبان سے اللہ کو خالق و مالک تو ضرور مانتے تھے مگر وہ اس کو "معبود" نہ سمجھتے تھے۔ اُن کا خدا اور معبود کے متعلق جو تصور تھا وہ غلط تھا۔ اُن کا زاویۂ فکر، اُن کا نصب العین اور اُن کا دستور العمل وہ نہیں تھا جس کا قرآن "مسلمان" سے مطالبہ کرتا ہے اور یہ وہ گمراہی تھی جس کو دور کرنے کے لئے آنحضرت مبعوث ہوئے تھے۔ لہٰذا ہم مسلمانوں کا بھی "لا الہ الا اللہ" زبانی کہنا ہمارے

ہزاروں برس سے اہل عرب داڑھی رکھتے تھے۔ خود آنحضرت صلعم اور صحابہ کرام اسلام کے پہلے ہی سے داڑھی رکھتے تھے۔ یہ عرب کا عام رواج تھا۔ وہاں کے یہودی، عیسائی اور مشرکین سب ہی داڑھی رکھتے تھے۔ آج بھی کتنے عیسائی، یہودی، زرتشتی، ہندو اور سکھ داڑھی رکھتے ہیں بہت سے چینی اور روسی بھی داڑھی رکھتے ہیں حالانکہ ان کا کوئی دینی مسلک نہیں۔ داڑھی کا تعلق محض رواج اور اپنی ذاتی پسند سے ہے بہت سے لوگوں کے چہرے پر داڑھی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا جس کو پسند ہو، جو رکھنا چاہے وہ شوق سے رکھے مگر اسلام سے اس کا مطلقاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اسلام کا ضروری جزو ہوتا تو قرآن اس کا ذکر ضرور کرتا، یہ ناممکن ہے کہ خدا کو داڑھی کی عربی نہ آتی ہو یا اُس میں کچھ بیان کرنا اللہ سے چھوٹ گیا ہو:۔

مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (انعام ۴) "ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے"

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ داڑھی اسلام کا ضروری جزو ہو اور قرآن اُس کے ذکر سے خالی رہ جائے؟ لہٰذا ہرگز داڑھی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۳)

اسلام کا تعلق ظواہر سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے اسلام میں "عبادت" جن چند مخصوص اوضاع اور اعمال و رسوم کا نام رکھ لیا گیا ہے۔ وہ سراسر باطل ہے "عبادت" ہر اُس کام کا نام ہے جو خدائی قانون کے مطابق کیا جائے۔

تاریخ خطیب بغدادی، امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایام جاہلیت کی یادگار ہے
رسول اللہ کا عقیقہ کب ہوا؟ اور ہوا تھا بھی تو وہ اسلامی رسم کس طرح کہلائیگی!
ختنہ بھی اسلامی چیز نہیں سکھا جاتا ہے کہ ختنہ سنت ابراہیمی ہے اور حضرت
ابراہیم کو ننانوے برس کی عمر میں اللہ تعالے نے ختنہ کرانے کا حکم دیا تھا۔
بھلا اس سے زیادہ لغوبات اور کون ہوسکتی ہے؟ قرآن میں اس کا کوئی
ذکر نہیں۔ یہ عقیدہ توراۃ سے لیا گیا ہے[1] اور اس کی لغویت ظاہر ہے۔
خدا اور ابراہیم دونوں موجود۔ مگر جب ابراہیم ننانوے برس کے بڈھے ہوگئے
تب اللہ کو خیال آیا کہ ابراہیم کا ختنہ نہیں ہوا ہے؟ ختنہ اگر اسلامی چیز
ہوتی تو حضرات صحابہ کرام کا بھی ختنہ ضرور کرایا جاتا۔ آخر وہ سب کے سب
رسول اللہ کی طرح مختون تو پیدا نہیں ہوئے تھے! اور اگر سبھوں کا ختنہ نہیں
ہوا اور وہ ایسے ہی مسلمان رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی شان میں صفاتی
الفاظ استعمال کئے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ختنہ کا اسلام سے کوئی تعلق
نہیں ہے اور واقعی ہے بھی نہیں۔ طبی حیثیت سے یہ مفید ضرور ہے۔ اس لئے
ختنہ ہو تو بہتر ہے۔ مگر اگر نہ ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق کفر و
اسلام سے نہیں ہے۔ آج بہت سی قوموں میں ختنہ کا رواج ہے حالانکہ
وہ مسلمان نہیں۔

داڑھی کا بھی کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہے۔ قبل از اسلام

---

[1] ملاحظہ ہو توراۃ کتاب پیدائش باب ۱۷

کسی عبادت کو نہ افادیت سے تعلق رہا ہے۔ نہ عقل و
بصیرت سے بلکہ یہ سب صرف اس لئے کیا جاتا ہے
کہ خدا کا حکم ہے۔ حالانکہ اسلام میں کوئی حکم خداوندی
ایسا نہیں جس میں افادی پہلو نہ ہو۔ حج ہی کو لیجئے
کہ اب یہ بے معنی رسم سے زیادہ حقیقت نہیں
رکھتا۔ حج میں "احرام" اور "طواف" کا قرآن نے ذکر کیا ہے
"احرام" یعنی دو بن سلی چادروں کا لباس، وحدتِ ملت
اور مساوات آدمیت کا محسوس مظہر ہے اور دنیا میں امن
و سلامتی قائم کرنے کے عزم کا اسلوب اظہار۔ اسی لئے
حالت احرام میں شکار ممنوع ہے۔ اور طواف کعبہ اس
عہد و پیمان کے اقرار کا ذریعۂ اظہار ہے کہ ہماری تمام
سعی اور سارے عمل کی گردشیں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں گی۔
یعنی اس امر کا اقرار کہ ہماری ہستی، قانون خداوندی کے
بقا و استحکام کے لئے ہے اور ہماری زندگی کی تمام گردشیں
اسی محور کے گرد گھومتی ہیں۔ "طائف" رات کے چوکیدار کو
کہتے ہیں اور "طواف" نہایت عمدہ خدمت گار کو۔ "طوف"
اُن بیلوں کو کہتے ہیں جو کھلیانوں پر گھومتے ہیں تاکہ اُن سے
غلہ برآمد ہو جائے۔ نیز اس مشکیزے کو بھی کہتے ہیں جس کے
ذریعے دریا پار کیا جائے۔ "طواف" کے ان معانی پر غور کیجئے

ہر وہ فعل عبادت ہے جس کی غرض اپنی اطاعت کا اظہار اور خدا کی خوشنودی ہو۔ عبادت کی وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے وہ سارے کام داخل ہیں جن کی انجام دہی کے لئے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ لہٰذا "عبادت" محض روزہ، نماز وغیرہ کا ہرگز نام نہیں کہ جو لوگ یہ چند ظاہری رسومات ادا کرلیں ان کو "مسلمان" کا خطاب دے دیا جائے۔

اسلام کو ان ظواہر کا پابند بنا دینے ہی سے یہ عام خرابی پیدا ہوگئی کہ لوگوں نے ان چند رسوم کو ادا کرلینا ہی زندگی کا سب سے بڑا فریضہ سمجھ لیا۔ اور بالآخر ان مراسم کی بے روح ادائیگی نے واقعی یہ حال کر دیا ہے کہ بقول علامہ پرویز:۔

"اسلام کی ساری چیز "قانون" سے بدل کر رسم ہوگئی پھر اور عمل تو کجا ارکان اسلام بھی رسم ہو کر رہ گئے۔ اب ہماری "صلوٰۃ" وہی ہے جو مذہب میں "پوجا پاٹ" یا "الیشور بھگتی" کہلاتی ہے۔ ہمارے "روزے" وہی ہیں جنہیں مذہب "برت" کہتے ہیں۔ ہماری "زکوٰۃ" وہی شے ہے جسے مذہب "دان" کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح ہمارا "حج" مذہب کے "یاترا" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اب یہ سب کام اس لئے کر لیا جاتا ہے کہ اس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ یعنی جس کو مذہب "پن" کہتا ہے اور "ثواب" کا حاصل "نجات" سمجھا جاتا ہے جس کو مذہب "مکتی" کہتا ہے۔ اب

بنایا گیا تھا۔ دُنیا کی کارواں سالاری اس کے تعلق کی گئی تھی :-

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ۱۷)

"تم کو ہم نے ایک معتدل جماعت بنایا ہے تاکہ تم دنیا والوں کے لئے گواہ بنو"

مگر آج مسلمانوں ہی کو یہ بتانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ "مسلمان" کس کو کہتے ہیں ؟ :-

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس رہے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے (اقبال)

ہونا ہی چاہیئے تھا جب کہ حال و حقیقت یہ ہے کہ :-

قُم باذنی اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن ! (اقبال)

"مسلمان" کس کو کہتے ہیں ؟ یہ ایک مصرع میں نظیری سے سُنئے۔ وہ کہتا ہے کہ :- ع

کسے کہ کُشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ایک شعر میں "مسلمان" کی تعریف اقبال سے سُنئے :-

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے "مسلمان"

یہ شعر سمجھ میں نہ آتا ہو تو یہ تعریف سُنئے :-

اور پھر سوچئے کہ یہ رسم کتنی بڑی مجرد حقیقت کے اظہار کا محسوس انداز ہے
اس مرکز توحید کے گرد جمع ہونے سے انسانی قلوب جس والہانہ
جذبات سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اُن کے اظہار
کے لئے کعبہ کے طواف کی رسم کو جاری رکھا مگر یہ سارے
افادی پہلو مسلمانوں نے نظر انداز کر دیئے۔ اب یہ سب کچھ
بے جانے بوجھے ایک "رسم" کے طور پر محض "ثواب" کے لئے
ہوتا ہے۔

غرض اسلام کو ان عناصر اربعہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ نہ تو مسلمان
اس کو کہتے ہیں جس کا عقیقہ و ختنہ ہوا ہو۔ نہ اس کو جس کا نام عبداللہ
وعمر وغیرہ ہو یا اس کے چہرے پر داڑھی ہو۔ حضرات ابوبکر، عمر، عثمان
اور علیؓ اسلام کا بہترین نمونہ ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب وہ کافر تھے
جب بھی اور جب مسلمان ہو گئے جب بھی بجنسہٖ وہ یکساں رہے۔ نہ اُن کا نام
بدلا، نہ لباس۔ نہ اُن کی شکل و صورت بدلی نہ وضع قطع، نہ ان کا عقیقہ
ہوا نہ ختنہ، نہ وہ پہلے داڑھی منڈاتے تھے اور نہ اسلام کے بعد رکھنے لگے
اگر اسلام کا ان چاروں میں کسی چیز سے بھی تعلق ہوتا تو یقیناً ان حضرات کی
ان ظاہری چیزوں میں تبدیلی آجاتی۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کے یہ عناصر اربعہ نہیں ہیں تو آخر "مسلمان"
کہتے کس کو ہیں؟ اللہ اللہ! یہ انقلاب بھی قابل عبرت ہے۔ از روئے
قرآن "مسلمان" وہ تھا جو تمام بنی نوع انسان کا ہادی و رہبر اور حاکم و رہنما

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ (حجرات ۲) اور مالوں سے جہاد کیا بس میرے نزدیک تو یہی لوگ سچے ہیں "

سُنا کچھ ؟ دیکھا "مسلمان" کا حلیہ اور نقشہ ؟ نہ نام کا ذکر، نہ لباس کا بیان، نہ شکل وصورت کی بات ہے نہ عقیقہ وختنہ کی گفتگو، نہ ڈاڑھی کا چرچا اور نہ رسمی عبادات کی کہانی۔ بس صرف ایثار ہی ایثار! اور محض قربانی ہی قربانی!!

یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم دھرنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں "مسلماں" ہونا

اور یہ وہ چیز ہے جو بغیر ختنہ ڈاڑھی اور بلا نماز روزہ سیدھے جنت میں پہنچا دیتی ہے۔ جنگ اُحد میں اصیرم کے متعلق رسول اللہ کا یہ فرمانا کہ :-

"اصیرم نے ایک وقت کی بھی نماز نہ پڑھی مگر سیدھا جنت میں چلا گیا "

اس حقیقت پر شاہد عادل ہے :-

غریب وسادہ ورنگیں ہے داستان حرم
نہایت اُس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ (اقبال)

"کافر" کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
"مومن" کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق (اقبال)

نثر میں "مسلمان" کی تعریف سننا ہو تو علامہ عرشی کی یہ سطریں دیکھئے:۔

"مسلم" نام ہمیں قرآن عزیز نے دیا ہے سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ کہہ کر یہ اصطلاح خود خالق فطرت نے تجویز کی ہے۔ اور اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ کے الفاظ سے دین اسلام کو ہمارا نصب العین قرار دیا ہے۔ پھر فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ کے حتمی الفاظ سے اسلام کو ہماری زندگی اور موت کی اساس بنا دیا ہے"۔

غور فرمایا کیا بات ٹھیری؟ "مسلمان" اس کو نہیں کہتے جس کی کوئی خاص وضع قطع ہو جس کا کوئی خاص لباس اور نام ہو جس کی کوئی مخصوص شکل و صورت ہو، بلکہ "مسلمان" وہ ہے جس کا صفاتی لقب "مسلم" (تابع فرمان) ہو جس کا نصب العین اسلام (فرمانبرداری) ہو اور جو پیدا ہونے کے دن سے مرتے وقت تک مسلمون (حکم بردار) رہے اگر قرآن سے آپ "مسلمان" کی تعریف سننا چاہتے ہیں تو بس صرف ایک آیت سنئے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	"مومن تو وہی ہیں جو اللہ اور
بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا	اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر
وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ	اُسی پر ڈٹے رہے اور جنہوں نے خدا کی راہ میں جان و

لہٰذا یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ نبوت و رسالت کی ابتدا حضرت نوح سے ہوئی ہے۔

(۲) قرآن بہت واضح طور پر "نبیوں" کو آدم کی اولاد میں سے ظاہر کرتا ہے:-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ (مریم ۴)	"یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ انبیاء میں سے، جو کہ آدم کی اولاد میں سے ہیں اور ان کی نسل سے جنکو ہم نے نوح کے ساتھ کشتی میں سوار کرایا تھا"

بھلا اس سے زیادہ اور کیا وضاحت چاہیئے کہ "نبیوں" کا ذکر کرتے ہوئے، اُن کو آدم کی اولاد میں سے اور اُن باقیات الصّلحٰت میں سے بتایا جا رہا ہے جو طوفان نوح سے بچ گئے تھے۔ پھر کیوں خواہ مخواہ یہ مانا جائے کہ پیغمبری نوحؑ کو جب ہی مل سکتی تھی جب آدمؑ کو ملتی؟ کیا نبوت و رسالت موروثی چیز ہے کہ جب تک مورث اعلیٰ کو وہ عہدہ نہ ملے اس کی اولاد کو نہیں مل سکتا؟ یہ آیت نہ صرف یہ واضح بیان کرتی ہے کہ نوحؑ سے نبوت شروع ہوئی بلکہ یہ بھی کھول دیتی ہے کہ جتنے بھی نبی ہوئے وہ اولاد آدم میں سے تھے۔

(۳) قرآن نے صاف صاف بتایا ہے کہ آدمؑ کے بعد سلسلۂ نبوت و رسالت قائم کیا گیا:-

يَا بَنِي آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ	"اے اولاد آدم! جب کبھی ایسا ہو کہ تم ہی

"آدم"

نوا آں زن کہ از فیضِ تو اورا
دگر بخشند ذوقِ انقلابے (اقبال)

آدم پیغمبر نہ تھے اور نہ ہو سکتے تھے لہذا اُن کو پیغمبر بتانا اور کہنا قرآن سے بے خبری اور فلسفۂ نبوت و رسالت سے نا واقفیت کی دلیل ہے۔

(۱) قرآن جب بھی نبوت و رسالت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی ابتدا حضرت نوحؑ سے کرتا ہے :-

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ (نسآء - ۲۳)

"ہم نے اے محمد! تمہارے پاس اُسی طرح یا وہی وحی بھیجی ہے جو نوح اور اُن کے بعد نبیوں کو بھیجی تھی"

قوموں کا حال جب بیان کیا جاتا ہے تو اُس کی پہل بھی قوم نوح سے کی جاتی ہے :-

اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ (توبہ ۹)

"کیا انھیں اُن قوموں کی ہلاکت کی خبر نہیں پہنچی جو اُن سے پہلے ہو گذری ہیں۔ جیسے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود"

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى آدَمَ وَنُوحًا وَّ "بیشک اللہ نے برگزیدہ بنایا آدم اور نوح
اٰلَ إِبْرٰهِيمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى کو اور آل ابراہیم کو اور آل عمران کو تمام
الْعٰلَمِينَ (آل عمران ۴) لوگوں پر"

اگر محض لفظ "اصطفٰے" سے آدم کو پیغمبر مان لیا جائے تب تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ "آل ابراہیم اور آل عمران" میں جتنے ہوئے سب کے سب پیغمبر تھے۔ کیونکہ لفظ "اصطفٰے" سب کے لئے ہے؟ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ دراصل یہاں "آدم" کی برگزیدگی بنی نوع انسان کی حیثیت سے دیگر مخلوقات پر اور "نوح" کی برگزیدگی نبوت کے لحاظ سے تمام آدمیوں پر بیان کی گئی ہے اور لفظ "اصطفٰے" ایسا برگزیدہ لفظ نہیں جو غیر نبی کے لئے استعمال ہی نہ ہو۔ چنانچہ اسی سورہ میں لفظ "اصطفٰے" حضرت مریم کے لئے بھی استعمال ہوا ہے:۔

يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ "اے مریم بیشک اللہ نے تجھ کو برگزیدہ بنایا
وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى اور ساری دنیا کی عورتوں کے مقابلے میں
نِسَآءِ الْعٰلَمِينَ (آل عمران) تجھے برگزیدہ بنایا"

حضرت مریم پیغمبر نہ تھیں۔ کیونکہ پیغمبر تو بقول قرآن ہمیشہ مرد ہوا کئے ہیں (یوسف ۱۲، نحل ۹، انبیا ۱) مگر ایک خاص قسم کی برگزیدگی اُن کو تمام عورتوں پر عطا ہوئی تھی۔ اس لئے اُن کے لئے بھی "اصطفٰے" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ لہٰذا سورۂ اعراف میں آدم و نوح کا نام ساتھ لے کر ان دونوں کے لئے لفظ "اصطفٰے" استعمال کرنے سے ان کو پیغمبر

رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ	میں سے میرے رسول تمہارے پاس آویں
اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا	اور میری آیتیں تمہیں پڑھ پڑھ کر سنائیں
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	تو جو کوئی اللہ سے ڈرے گا اور اپنی اصلاح
يَحْزَنُوْنَ (اعراف ۴)	کرلے گا اس کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا نہ غم۔"

غور فرمایئے اولاد آدم سے خطاب ہے کہ جب میرے پیغمبر تمہارے پاس آویں اور کتاب پیش کریں تو تم اس کا اتباع کرنا۔ اگر آدم پیغمبر تھے تو یہ خطاب غلط اور اگر خطاب صحیح ہے تو یہ غلط ہے کہ آدم پیغمبر تھے۔ آدم کے ذکر ہی میں، اُن کی اولاد سے یہ کہنا کہ جب کبھی کوئی پیغمبر تم میں سے، تمہارے پاس آوے تو اس پر ایمان لانا یا اس کی پیروی کرنا، بجائے خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آدم پیغمبر نہ تھے ورنہ یہ کہنا کیا معنی کہ "جب تم میں رسول آوے"! اگر آدم پیغمبر تھے تو بنی آدم سے کہا جاتا کہ "دیکھو تمہارے باپ آدم پیغمبر موجود ہیں تم ان کی پیروی کرو"۔ جب ایک پیغمبر موجود ہی ہے تو اس کی موجودگی کے باوجود یہ کہنا کیا معنی کہ جب کوئی پیغمبر آوے تو اس کی پیروی کرنا! اس سے صاف ظاہر ہے کہ آدم پیغمبر نہ تھے بلکہ نبوت و رسالت حضرت نوحؑ سے شروع ہونے والی تھی اس لئے اولاد آدم کو قبل ہی متنبہ کر دیا گیا۔

(۴) چونکہ قرآن کی ایک آیت میں آدم و نوح دونوں کا نام ساتھ آیا ہے اور اس کے ساتھ "اصطفیٰ" کا لفظ آیا ہے۔ اس لئے آدم کو بھی نوح کی طرح پیغمبر سمجھا جاتا ہے:۔

"رسول" وہ نبی ہے جو نئی کتاب اور نئی شریعت لاتا ہے۔
(۳) چونکہ آدم کوئی کتاب نہیں لائے تھے اس لئے وہ صرف "نبی" ہیں اور "رسول" نہیں۔
(۴) نئی کتاب کے ساتھ ساتھ شریعت بھی نئی نئی بدلتی رہتی ہے۔

قرآن بلحاظ ہدایت و تعلیمات تمام صحائف آسمانی کے ایک ہونے کا دعویدار ہے۔ اسی طرح سارے پیغمبروں کی تعلیمات کو بھی ایک بتاتا ہے۔ اسی طرح کل پیغمبروں کی شریعت کو بھی ایک قرار دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب شروع سے آخر تک اصولی اعتبار سے "شریعت" ایک ہی تھی تو تمام کتابوں کی تعلیمات بھی اصولی طور پر ایک ہی ہوں گی۔ اور جب پیغمبر کتاب کی پیروی خود بھی کرتے تھے اور تمام متبعین سے بھی کراتے تھے تو سب کی تعلیمات ایک ہی ہوں گی۔ لہذا علامہ سیوہاروی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ محض خیال ہی خیال ہے اور ایسا خیال جو قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ "پیغمبروں" کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:۔

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (نحل ۵)
"اور ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور بھیجا کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو"

(۲) وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ
"ہم نے تم سے پہلے، ایسا کوئی پیغمبر

نہیں کہدیا جائے گا۔

(۵) جناب علامہ فاروقی قرانی نازیپوری نے اپنے رسالہ "سیرت" (بنارس) کے جنوری نمبر ۱۹۵۳ء میں "قرآنی قصے" کے تحت آدم کے متعلق فرمایا ہے :-

"حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں سب سے پہلے شخص اور پہلے "رسول" ہیں" (صفحہ ۳۹)

مگر علامہ حفظ الرحمٰن سیوہاروی "قصص القرآن" جلد اول کے صفحہ ۳۲ پر فرماتے ہیں۔

"وہ بلاشبہ خدا کے سچے پیغمبر اور نبی برحق تھے"

موصوف نے اس امر کو بھی دو جگہ صاف کیا ہے کہ "نبی" اور "رسول" میں کیا فرق ہے ؟ :-

"شریعت اسلامی میں "نبی" اس ہستی کو کہتے ہیں جس کو حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے چن لیا ہو۔ اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہوتی ہو اور "رسول" اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی جانب سے نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو"

(جلد ۱ صفحہ ۳۲ جلد ۲ صفحہ ۳۱)

اس سے چار باتیں ظاہر ہوئیں :-

(۱) "نبی" اور "رسول" دو چیزیں ہیں اور دونوں میں کچھ فرق ہے۔

(۲) "نبی" وہ ہے جس کو کتاب و شریعت نہیں ملتی اور

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (شوریٰ ۲)

"اللہ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسکو ہم نے تمہارے پاس وحی کیا ہے اور جسکا ہم نے ابراہیم و موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا"

جو شریعت نوح سے حضرت عیسیٰ علیہم السلام تک کو ملی تھی وہی آنحضرت صلعم کو بھی عطا ہوئی تھی۔ گویا نوح سے محمدؐ تک "شریعت" ایک ہی کارفرما رہی۔ البتہ کتاب کی جلدیں اور شخصیتیں بدلتی رہیں۔ لہذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ کتاب کے ساتھ ساتھ شریعت بھی بدلتی رہی۔ یہ آخری اور چوتھی شق کا جواب تھا۔ اب آیئے۔ پہلی اور دوسری شق پر کہ "نبی" اور "رسول" میں فرق ہے اور "نبی" وہ ہے جس کو کتاب نہیں ملتی اور "رسول" وہ نبی ہے جس کو کتاب و شریعت ملتی ہے۔ اسی کے جواب پر شق ۳ کا فیصلہ از خود ہو جائیگا کہ آدمؑ "نبی" تھے یا "رسول" یا کچھ نہیں۔

علامہ فاروقی کا دعویٰ ہے کہ آدمؑ "رسول" تھے۔ علامہ سیوہاروی آدم کو "نبی" بتاتے ہیں۔ اور "نبی" و "رسول" کا فرق یہ بتاتے ہیں کہ "نبی" وہ ہے جس کو کتاب نہیں ملتی۔ اسی لئے موصوف نے "نبی" اور "رسول" کی الگ الگ ہیڈنگ بنائی ہے اور آدم کو اس لئے "نبی" قرار دیا ہے کہ آدم کو "کتاب" نہیں ملی تھی۔ بات اتنی رہجاتی ہے کہ "نبی" کو کتاب ملتی ہے یا نہیں؟ اگر میں "قرآن" سے یہ ثبوت پیش کروں کہ "نبی" کے ساتھ "کتاب" کا نزول لازمی ہے تو غالباً اس کے ثابت ہو جانے میں کوئی شک

مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء ۲)

نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں لہٰذا تم میری ہی عبادت کرو"

(۳) مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ (حم سجدہ ۵)

"تم سے بھی وہی کچھ کہا جا رہا ہے جو تم سے پہلے کے رسولوں سے کہا گیا تھا"

اس سے معلوم ہوا کہ اصولی طور پر سارے پیغمبروں کی تعلیمات ایک ہی تھیں۔ لہٰذا یہ بھی ضروری ہے کہ اصولی طور پر تمام کتابوں کی بھی تعلیمات ایک ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہے۔ قرآن کے بارے میں اہل کتاب سے کہا جاتا ہے کہ:-

(۱) اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰی (اعلیٰ ۱)

"یہی سب کچھ تو اگلے صحائف میں بھی تھا"

(۲) اِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (شعرا ۱۱)

"اور یہی سب کچھ پہلی کتابوں میں بھی تھا"

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب بھی بلحاظ تعلیمات ایک تھیں۔ نئی اور پرانی کا اگر کوئی فرق تھا تو صرف یہ کہ ہر بعد میں آنے والی کتاب۔ اپنی پہلی کتاب کا جدید ترین ایڈیشن تھی۔ دفیتن، زبان اور لانے والا البتہ بدل جاتا تھا۔ مگر اصولی طور پر تعلیمات میں کوئی فرق نہ تھا، سب ایک تھیں اسی لئے "شریعت" بھی شروع سے آخر تک ایک ہی رہی:

بغیر "کتاب" کے آتا ہی نہیں۔ قرآن کو اس امر پر اصرار ہے کہ اس نے نبیوں کے ساتھ کتاب بھی نازل کی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ "نبی" کے ساتھ "کتاب" لازمی ہے۔ اب غالباً اس امر میں شک کی گنجائش نہ رہی ہوگی کہ "نبی" اور "رسول" کا یہ فرق بیان کرنا کہ "نبی" وہ ہے جس کو "کتاب" نہیں ملتی اور "رسول" وہ نبی ہے جس کو نئی شریعت اور نئی کتاب ملتی ہے باطل ہے۔ "نبی" اور "رسول" میں جو لوگ فرق کرتے اور بتاتے ہیں۔ نہ انھوں نے قرآن میں کبھی غور کیا اور نہ "رسول" و "نبی" یا "نبوت" و "رسالت" کو سمجھنے کی کوشش کی۔ ورنہ ایسا فرق کبھی نہ کیا جاتا۔

کوئی نظم اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک اس کے لئے کچھ اصول نہ مقرر کر دیئے جائیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ نے بھی اپنی تمام مخلوق کے لئے کچھ اصول زندگی متعیّن کر دیئے ہیں جن کی پابندی لازمی ہے۔ جہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی غیر انسانی مخلوق کا تعلق ہے جو اصول اور قوانین اُن کے لئے متعین ہیں وہ اُن کی فطرت کے اندر داخل کر دیئے گئے ہیں جن پر وہ کاربند ہیں۔ مگر "انسان" اشرف المخلوقات اور صاحب عقل ہے اسلئے اسکو دیگر مخلوق سے جدا کر دیا گیا اور اس کی زندگی کے لئے جو محکم قانون اور غیر متبدّل اصول ہیں وہ اُس کی فطرت کے اندر نہیں داخل کئے گئے بلکہ انھیں یہ غیر متبدّل اصول زندگی کا علم دینے کے لئے انداز یہ اختیار کیا گیا کہ انسانوں ہی میں سے بعض کو چُن لیا جاتا اور اُنھیں اُن محکم اُصولوں کا علم دے کر اُنھیں اس پر مامور کر دیا جاتا کہ وہ اس

نہ رہے گا کہ آدم نبی نہیں تھے کیونکہ آدم کے ساتھ کتاب کا نزول آج تک کہیں ظاہر نہیں کیا گیا۔ دیکھئے "نبی" کے ساتھ "کتاب" کے نزول کا ثبوت:-

(۱) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ (حدید ۲۶)

"اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو بھیجا اور ان کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا نزول جاری رکھا"

(۲) وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ (عنکبوت ۳)

"اور ہم نے اس کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا نزول جاری رکھا"

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ نبوت اور کتاب لازم و ملزوم ہے۔ دوسری آیت ملاحظہ ہو۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ (آل عمران ۹)

"اور جبکہ اللہ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت دوں"

اس سے معلوم ہوا کہ نبیوں سے جو عہد لیا گیا تھا۔ اس میں ان کو کتاب اور حکمت دونوں چیزوں کے دیئے جانے کا بطور خاص ذکر تھا اور سنئے:-

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (بقرہ ۲۶)

"سو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے تھے اور ڈرانے والے اور اُن سب کے ساتھ کتاب بھی نازل کی جو حق کی ضامن تھیں"

غور فرمائیے اس سے زیادہ ثبوت اور اس بات کا کیا چاہیئے کہ "نبی

(۲) كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (بقرہ ۴۰) "سب کے سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر"

دیکھا؟ کوئی تفرق نہیں۔ اسی طرح جس طرح "نبیوں" کو "مبشرین ومنذرین" کہا گیا ہے۔ اسی طرح "رسولوں" کو بھی:۔

(۱) فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (بقرہ ۴۰) "سو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو بشارت دینے والے بھی ہیں اور ڈرانے والے بھی"

(۲) وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (کہف ۵۶) "اور ہم اپنے رسولوں کو بھیجا کرتے ہیں بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر"

اسی طرح نبیوں کتاب کے سلسلے میں بھی دونوں کا ایک ہی طرح سے ذکر کیا گیا ہے۔ کیونکہ "نبوت" اور "رسالت" لازم وملزوم ہیں:۔

(۱) لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (حدید ۲۵) "ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور ان سب کے ساتھ کتابیں نازل کیں"

(۲) فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ (بقرہ ۲۱۳) "سو اللہ نے نبیوں کو بھیجا جو مبشر ومنذر تھے اور ان سب کے ساتھ کتابیں نازل کیں"

چنانچہ یہی دیکھئے کہ چونکہ آخری غیر متبدل اصول حیاتِ انسانی قرآن کی شکل میں آگئے اور اسی لیے قوانین قیامت تک جاری اور کارفرما رہینگے

علم کو دوسروں تک پہنچادیں۔ اسی ذریعۂ علم کا نام "وحی" ہے جو مسطور و مدوّن ہوکر "کتاب" کہلاتی ہے اور اس علم کے ملنے کو "نبوت" کہتے ہیں اور جس کو یہ علم دیا جاتا ہے وہ "نبی" کہلاتا ہے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کو "رسالت" کہتے ہیں اور جو پہنچاتا ہے وہ "رسول" کہلاتا ہے ظاہر ہے کہ اس سبب سے "نبی" اور "رسول" میں کوئی تفریق ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر "نبی" کا "رسول" ہونا لازمی ہے اور ہر "نبی" کے ساتھ "کتاب" کا آنا ضروری ہے۔ کوئی "نبی" ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو "رسول" نہ ہو اور جس کو "کتاب" نہ ملی ہو "نبی" وہی ہوگا جس کو زندگی کے غیر متبدّل اصول بذریعہ "وحی" ملیں گے اور وہ ان کو "کتاب" کی شکل میں مدوّن کرکے خدا کے بندوں تک پہنچائے گا۔ لہٰذا کوئی محض "رسول" نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب اس کو "کتاب" ملے ہی گی نہیں تو وہ دوسروں تک پہنچائیگا کیا؟ اسی طرح کوئی محض "نبی" نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کو "کتاب" ملی ہی کاہے کو جب وہ دوسروں تک پہنچا نہ سکے؟ لہٰذا "نبوت" اور "کتاب" اور "رسالت" لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ قرآن نے "نبی" اور "رسول" میں کہیں کوئی فرق نہیں کیا ہے بلکہ دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے مثلاً جب "ایمان" لانے کا ذکر کیا ہے تو کہیں "نبی" کہا ہے اور کہیں "رسول" کیونکہ دونوں ایک ہی چیز ہیں:-

(۱) مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (بقرہ ۲۷) "جو اللہ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور نبیوں پر"

کا کام جاری رہے گا اور اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ قرآن ساری دنیا کے تمام افراد تک نہ پہنچ جائے یا قیامت نہ آجائے اور یہ کام اُمّت محمدی کرے گی۔

اب اس بحث سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی کہ "نبی" اور "رسول" میں حقیقتاً کوئی فرق نہیں بلکہ جو نبی ہو گا وہ رسول بھی ہو گا اور اس کو کتاب بھی ملے گی اور کوئی "نبی" ایسا نہیں ہو سکتا جس کو کتاب نہ ملے۔ کیونکہ کسی کو "نبوت" عطا ہی اس لئے ہوتی ہے کہ اس کو "کتاب" دی جائے۔ لہٰذا "جو نبی" ہو گا اس کو بالیقین "کتاب" ملے گی۔ اور چونکہ آدمؑ کو کوئی "کتاب" نہیں ملی اس لئے "وہ نبی" ہرگز نہیں تھے۔ اور "جو نبی" ہی نہیں وہ "رسول" کیا اور کیونکر ہو سکتا ہے لہٰذا آدم نہ "رسول" تھے اور نہ "نبی" چونکہ قرآن سے تو نفرت ہے اس لئے اس کی طرف کوئی توجہ کرتا ہی نہیں اور جس کے جو دل میں آتا ہے کہہ دیتا ہے۔

(۶) آدم کے سلسلے میں ایک اور غلط فہمی عام ہے۔ لوگ آدم کو "خدا کا خلیفہ" یا "زمین پر خدا کا نائب" قرار دیتے ہیں۔ مئو کے مدرسہ مفتاح العلوم" کے ایک مدرس نے رسالہ "دارالعلوم" دیوبند کے ستمبر نمبر ۱۹۵۲ء میں فرمایا ہے:-

"یہ حقیقت تمام اُمت کے نزدیک مسلّم ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے جب دنیا میں اپنا نائب وخلیفہ پیدا کرنا چاہا اور ارشاد ہوا۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ ۳)،

اور اب نئے اصول زندگی انسانوں کو دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لئے "نبوت" کا سلسلہ ختم کر دیا گیا اور آنحضرت صلعم کو "خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ" فرمایا گیا یعنی اب "نبوت" یا "نبی" کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ "نبی" کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ اس کو "کتاب" یعنی غیر متبدّل اصول زندگی دیا جائے۔ اب جب کہ غیر متبدّل اصول زندگی قرآن کی شکل میں ہمیشہ کے لئے آگیا، تو اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ کوئی "نبی" ہو۔ لہٰذا "نبوت" کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ مگر غور کیجئے آنحضرت کو "خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ" تو کہا گیا ہے "خَاتَمُ الرُّسُل" نہیں۔ کیونکہ "رسالت" یعنی اُن غیر متبدّل اصول زندگی کو جو آخری طور پر قرآن میں آئے ہیں، تمام بندگان خدا تک پہنچانے کا سلسلہ ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور رسول اللہ یہ کام اپنی امّت کے سپرد کر گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے بزبان وحی فرمایا:۔

وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ (الانعام ۲)	"اور مجھ پر یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعے تم کو بھی ڈلاؤں اور جس جس کو یہ پہنچے۔"

لہٰذا "نبوت" تو ختم ہو گئی کیونکہ اب کوئی نیا قانون نہیں آئے گا[1] مگر رسالت

---

[1] چونکہ یہ قرآن آخری قانون ہے اور اب کوئی نیا قانون نہ آئے گا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی (حجر ۱)، ورنہ اس سے پہلے کی کتابوں کی حفاظت اس قوم کے علما اور مشائخ کے متعلق تھی (مائدہ ۷)

"خلیفہ" یعنی بعد کو آنے والا" اور "قائم مقام" کہیں گے۔ خواہ یہ نیابت سابق کی موت و عزل کے سبب سے ہوتی ہو یا غیبت کی وجہ سے یا اپنا اختیار اور منصب سپرد کر دینے کی وجہ سے "

(خطباب آزاد صفحہ ۱۹۲)

اب غور فرمائیے کہ قرآن کی اس آیت میں خَلِیْفَۃُ اللّٰہ" کا لفظ نہیں ہے بلکہ خَلِیْفَۃُ الْاَرْض کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب اگر آدم خدا کے خلیفہ اور نائب یا قائم مقام ہیں تو سارے انسان خدا کے خلیفہ اور نائب یا قائم مقام ہوئے۔ انسانوں میں ابراہیم و موسیٰ بھی ہیں اور نمرود و فرعون بھی شعیب و ہارون بھی ہیں، اور ہامان و قارون بھی۔ عیسیٰ و محمد بھی ہیں اور شداد و ابوجہل بھی۔ جب کوئی استثنا کا پہلو اس آیت میں موجود نہیں اور "آدم" کو خدا کا خلیفہ، نائب اور قائم مقام کہا گیا ہے تو پھر تمام مشرکین و کفار اور دنیا کے سارے چور، ڈاکو، قاتل، زانی، بدمعاش اور فسادی بھی خدا کے خلیفہ نائب اور قائم مقام ہوں گے اور کہلائیں گے؟ پھر کیا یہی ٹھیک ہے؟ حالانکہ معمولی عقل والا بھی کہدے گا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ پھر دوسرا پہلو یہ ہے کہ خلیفہ، نائب یا قائم مقام یا بعد کو آنے والا وغیرہ تو جب ہی کوئی ہوسکتا ہے:۔

(۱) جب سابق کی موت واقع ہو چکی ہو

(۲) جب وہ معزول ہو چکا ہو جس کے بعد یہ نائب آیا ہو۔

(۳) جب وہ خود وہاں پر موجود و حاضر نہ ہو جہاں یہ خلیفہ ہے۔

"میں زمین میں ایک نائب و خلیفہ بنانا چاہتا ہوں"۔ تو حضرت آدم علیہ السلام کو خلعت وجود سے آراستہ فرمایا۔"

اس آیت میں "خَلِیفَۃُ اللّٰہ" نہیں ہے کہ اس کا ترجمہ "اللہ کا نائب" کیا جائے مگر سارے مُلّا یہی کہتے اور عوام کو سمجھاتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں "انسان کے خلیفۃ الارض" ہونے کا ذکر ہے۔ میں لگے ہاتھ چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر بھی اس عام غلطی کا ازالہ کردوں اور دکھا دوں کہ ہمارے مُلّا قرآن میں غور و فکر نہ کرکے کیا اوٹ پٹانگ ہانکا کرتے ہیں۔

"خلیفہ" کے لغوی معنی ہیں "جانشین"۔ "قائم مقام" "بعد میں آنے والا"۔ "کسی کی غیر حاضری و عدم موجودگی میں اُس کی جگہ پر بیٹھنے والا"۔ انگریزی میں "خلیفہ" کو (Successor) اور "نمائندہ" کو Representopine کہا جاتا ہے۔ قرآن نے انسان کو "زمین کا خلیفہ" کہا ہے اور خلیفہ کا جو مفہوم میں نے بیان کیا ہے وہی مفہوم دورِ حاضرہ کے سب سے بڑے عالم علامہ ابوالکلام صاحب آزاد بھی فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

"خلافت" عربی کا ایک مصدر ہے۔ اس کا مادہ ہے "خلف"

اور اسی سے ہے "خلیفہ"۔ "خلیفہ کے لغوی معنے "نیابت"، اور "قائم مقامی" کے ہیں مِنْ ذٰلِکَ خَلُفَ فلان فلانا فی ھذا الامر اِذا قام مقامہ فیہ بعدہ (ابن فارس)

یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کے بعد، اس کا نائب اور قائم مقام ہوا تو یہ "خلافت" ہوئی اور لغت میں اس کو

"خلیفہ" کا لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے یعنی عربی زبان کے اُن لفظوں میں سے ہے جن کو لغت میں عام معنی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر قرآن حکیم نے اپنے خاص مصطلحہ شرح معانی کے لئے اختیار کر لیا۔ جیسے ایمان، غیب، تقدیر، بعث، صلوٰۃ وغیرہ ذالک۔ ایمان کے لغوی معنی یقین اور طمانیت اور زوال خوف و شک کے تھے۔ لیکن قرآن حکیم نے اس کو ایک خاص طرح کے یقین و اقرار اور عمل کے لئے استعمال کیا اور اب ایمان قرآن کی بولی میں عام لغوی معنی کے خلاف۔ ایک خاص اصطلاح قرار پا گئی ہے۔ قرآن کی زبان میں "خلافت" اور "استخلاف فی الارض" اور "وراثت و تمکن فی الارض" سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ . . . قرآن کے نزدیک اس خلافت ارضی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کے لئے ایک خاص ذمہ دار قوم و حکومت قائم ہو۔" (خطبات آزاد صـ ۱۹۲)

پھر صفحہ ۱۹۵ پر لکھا ہے:۔

"قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز "خلافت" ہے وہ خلافت فی الارض ہے۔ یعنی زمین کی حکومت و تسلط"

(۴) جب اُس نے جس کا یہ نائب ہے اپنا منصب اس کے حوالہ کر دیا ہو۔

خدا کے لئے ان تمام صورت حال کا تصوّر باطل اور کفر ہے۔ خدا حیّ و قیوم ہے۔ مرا نہیں اور نہ مر سکتا ہے۔ خدا خود ہر وقت اور ہر جگہ حاضر و موجود ہے۔ خدا نے اپنا کوئی منصب بھی کسی بندے کے حوالے نہیں کیا ہے۔ خدا نہ معزول ہوا ہے اور نہ اسکو کوئی کبھی بھی اس کے منصب سے معزول کر سکتا ہے۔ بلکہ خدا ہی کا سارا حکم چل رہا ہے۔ اَلْحُکْمُ لِلّٰہِ اور اس شان سے چل رہا ہے کہ لَا یُشْرِکُ فِی حُکْمِہٖ اَحَدًا "وہ اپنے حکم میں کسی کو بھی شریک نہیں کرتا"۔ پھر جب صورت حال یوں ہے اور خلیفہ، نائب اور قائم مقام کے لئے جتنی شکلیں بھی ہو سکتی ہیں اُن میں سے ایک بھی یہاں نہیں تو آدم کو خدا کا خلیفہ، نائب اور قائم مقام کس طرح کہا جاتا ہے یا کہا جا سکتا ہے؟ خلیفہ، نائب اور قائم مقام کوئی بھی "انسان" ہو سکتا ہے تو کسی "انسان" ہی کا نہ کہ خدا کا؟۔ کیونکہ "خلافت" کی جو شرطیں ہیں۔ اُن میں سے ایک شرط کا بھی خدا کے بارے میں تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ عام غلط فہمی کہ آدم زمین پر خدا کے خلیفہ، نائب اور قائم مقام ہیں، محض اس لئے پیدا ہو گئی ہے کہ قرآن میں لوگ غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ ورنہ اس طرح کی غلطی یا غلط فہمی نہ ہوتی۔ علامہ آزاد کی بصیرت قرآنی نے اس مسئلے کو بخوبی سمجھ لیا ہے سُنئے:۔

(۴) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور ۵۵) كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور ۵۵)

"جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور اعمال صالح کریں گے۔ اللہ اُن سے وعدہ کرتا ہے کہ انھیں زمین کا حاکم بنائے گا" عطا کرے گا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اس نے تم سے پہلے والوں کو حکومت عطا کی تھی۔"

ان آیتوں پر ذرا بھی غور کیا جائے تو فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ "خلافت" اور "خلیفہ" کا لفظ اللہ تعالےٰ نے قرآن میں بمعنی قائم مقام اور نائب نہیں بلکہ حکومت و سلطنت اور عمران کے معنی میں استعمال کیا ہے اس لئے آدم کو خدا کا نائب اور قائم مقام کہنا جہالت ہے۔ اگر سب انسان خدا کے نائب و قائم مقام ہیں تو سارے سچے شہدے، بے ایمان، مجرم، کافر اور مشرک اور سارے علماء مشائخ، مجاور، حافظ، حاجی اور متقی سب ایک فہرست میں چلے آئیں گے۔ ابراہیم و نمرود کی موسیٰ و فرعون کی، محمدؐ اور ابوجہل کی سطح ایک ہو جائے گی۔ کیونکہ خدا کے نائب آدم تھے اور سب انسان آدم کی اولاد ہیں۔ کس قدر مقام حیرت ہے کہ لوگ دن رات قرآن تلاوت کرتے ہیں مگر آدم کے بارے میں بھی ایک حرف نہیں جانتے۔ کوئی اُن کو رسول کہتا ہے۔ کوئی نبی اور کوئی خدا کا نائب اور قائم مقام حالانکہ وہ بیچارا ان میں سے کچھ نہ تھا علامہ اقبال نے ٹھیک کہا تھا:۔

غالباً اب یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ "خلیفہ" کا مروجہ لغوی مفہوم سراسر غلط اور خلاف قرآن ہے۔ قرآن نے خَلِیْفَۃُ الْاَرْض کہا اور ملّاؤں نے اس کو "خلیفۃ اللہ" بنا دیا۔ خدا نے انسان کو "زمین کا حاکم" فرمایا اور مسلمان "خدا کے نائب" اور "خدا کے قائم مقام" بن بیٹھے۔ قرآن تقلید سے عمر بھر سمجھ میں نہ آئے گا۔ بلکہ صرف غور و فکر سے۔ "انسان" "زمین پر خدا کا خلیفہ" "خدا کا نائب" اور "خدا کا قائم مقام" نہیں ہے۔ یہ تصور ہی باطل ہے۔ کیونکہ جب اللہ خود ہر وقت ہر جگہ حاضر و موجود اور حکمران ہے تو اُس کا نائب اور قائم مقام کیا؟ اللہ تعالےٰ نے لفظ "خلیفہ" بمعنی نائب و قائم مقام استعمال نہیں کیا ہے بلکہ بمعنی حکمران اور مالک استعمال کیا ہے اور یہ مفہوم بادنیٰ غور و فکر ہر شخص سمجھ سکتا ہے:۔

(۱) اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (بقرہ ۴) — "میں زمین کا ایک حکمران یا مالک بنانے والا ہوں"

(۲) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ..... لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ (انعام ۲۰) — "اللہ ایسا ہے جس نے تمہیں زمین کی حکومت دی .... تاکہ وہ اُن چیزوں کے ذریعے جو اُس نے تم کو دی ہیں، تم کو آزمائے۔"

(۳) ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (یونس ۲) — "پھر اُن کے بعد، اُس نے تم کو زمین میں حکومت عطا کی تاکہ دیکھے کہ تم کیسے کام کرتے ہو"

"عید"

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق (اقبالؔ)

"حقیقت" ہمیشہ ایک اور صرف ایک ہوا کرتی ہے۔ دو اور دو جب ہوگا تو چار ہی۔ "اسلام" بھی ایک حقیقت ہے ٹھوس اور ایک صداقت ہے قطعی۔ لہٰذا اس کی بھی تعبیر ہمیشہ ایک ہی ہونی چاہیئے۔ مگر ہمارے "مروجہ اسلام" میں کسی اسلامی چیز کے بارے میں بھی، کبھی اور کہیں، ایک خیال نہیں ملے گا۔ یہ خدائے واحد کو ماننے والی قوم اس وقت، ہر اسلامی شعار کے بارے میں متعدد اور متضاد عقیدہ و خیال رکھتی ہے۔ اس وقت میرے سامنے دہلی کا مشہور ماہنامہ "آستانہ" (جولائی نمبر ۱۹۵۳ء) ہے۔ اس میں عید سے متعلق کئی مضامین ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ "اسلام" میں "عید" کا رواج کیوں ہوا۔ ہر اہلِ قلم نے اپنے اپنے علم و خیال کے مطابق اس "اسلامی جشن" پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر سب صرف خیال ہی خیال ہے اور محض وہم ہی وہم۔

ایک صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ رسم رسول اللہ نے اس لئے مدینہ جاکر

مکتب و ملا و اسرار کتاب — کور مادر زاد و نور آفتاب
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قلاش اقوش فرد فرد
از شکر گفتہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں دادد خروش
ناں سوے گردوں دلش بیگانۂ — نزد او اُم الکتاب، افسانۂ

دین کافر، فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

(اقبال)

ہے ؟ اور پھر یہ "قومی جشن" کیسے ہوگیا جبکہ یہ محض "روزہ داروں" ہی کے لئے ہے؟

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "عید" کو عید اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کو اپنی رحمت خاص سے نوازتا ہے۔ اگر یہ ہے تو کیا اللہ شوال میں رحمت سے نوازتا ہے ؟ اگر رمضان میں نوازتا ہے تو یہ "جشن" رمضان ہی میں منانا چاہیئے نہ کہ رمضان گذرنے کے بعد؟ اور اگر شوال میں نوازتا ہے تو یہ پہلی شوال ہی کو "اڈوانس جشن" کیسا ؟

ایک صاحب کی رائے ہے کہ "عید" دراصل فرائض رمضان کی ادائیگی سے بخیر وخوبی سبکدوشی کا جشن ہے۔ یہ بات بھی مہمل ہے۔ "روزہ" کا حکم یا رواج اسلام سے پہلے کے تمام ادیان میں رہا ہے۔ ہر قوم "روزہ" رکھتی آئی ہے۔ اسلام میں "روزہ" کوئی ایسا کڑا اور انوکھا فرض نہ تھا جو صرف "مسلمانوں" ہی پر عائد کیا گیا ہو جس کی تکمیل پر وہ کوئی "جشن مسرت" منائیں؟ خود قرآن ہی نے :-

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا	"تم لوگوں پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے
كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ	جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا
(البقرہ ۲۳)	گیا تھا"

کہہ کے بتا اور جتا دیا ہے کہ یہ پابندی تم پر انوکھی اور نرالی نہیں ہے۔ بلکہ اس کا رواج تمام اگلی امتوں میں رہا ہے۔ لہذا "روزہ" کا رواج بہت قدیم ہے۔ مگر کسی قوم کسی دین اور کسی زمانہ میں "روزہ" کے اختتام پر کبھی کوئی "جشن" نہیں منایا گیا اور نہ آج تک کہیں کسی جگہ بھی منایا جاتا ہے۔

قائم کی کہ اہل مدینہ قبل از اسلام "جشن نوروز" اور "جشن مہرجان" منایا کرتے تھے۔ رسول اللہ نے اس رسم کو "عید" اور "بقر عید" میں بدل دیا۔ اگر واقعی ایسا ہوتا تو "عید" اسی دن منائی جاتی جس دن اہل مدینہ یہ جشن منایا کرتے تھے۔ اہل مدینہ پہلی شوال کو کبھی کوئی جشن نہیں مناتے تھے مگر اس دن مسلمان "یہ جشن عید" مناتے ہیں۔ پھر کیا وجہ تھی کہ رسول اللہ نے رسم تو اہل مدینہ کی لے لی مگر "دن" بدل دیا؟ دیگر اہل مذاہب کے تتبع میں اگر رسول اللہ "جشن عید" مناتے اور قائم کرتے تو یہ ہرگز نہ کرتے کہ "جشن" تو اُن کا مستعار لیتے اور "موقع" بدل دیتے۔ بلکہ وہ اسی دن کو منتخب فرماتے تاکہ مسلمان اس دن، اُن لوگوں کے مقابلے میں پھیکے پھیکے نہ رہیں۔

ایک صاحب فرماتے ہیں کہ "پولیس اور ملٹری فورس" میں سال بھر میں ایک ماہ "ریفریشر کورس" کا ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس کی بنیادی تعلیم از سر نو تازہ ہو جائے۔ یہی مثال بعینہٖ رمضان المبارک کے روزوں کی ہے اور جس طرح سول پولیس کو "ریفریشر کورس" پورا کرنے کے بعد "تھانہ" پر جانے کی بڑی مسرت ہوتی ہے۔ اسی طرح روزہ دار کو روزہ کا کورس پورا کرنے پر عید کے دن خوشی ہوتی ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے جیسا کہ یہ صاحب فرماتے ہیں تو کوئی سپاہی "ریفریشر کورس" کے ختم ہونے والے آخری دنوں میں کسی دن سوگ نہیں مناتا۔ پھر مسلمان رمضان کے اختتام پر آخری جمعہ میں کیوں غم مناتے ہیں؟ یہ "الوداع" رو رو کر کیوں پڑھتے ہیں اور پھر وہ مسلمان کیوں عید مناتا ہے جو یہ "ریفریشر کورس" پورا نہیں کرتا اور روزہ نہیں رکھتا

میں آخری جمعہ کے روز تو مسلمان روزہ کر "الوداع" پڑھیں اور اس غم کا اظہار کریں کہ رمضان المبارک ختم ہو رہا ہے۔ مگر جب وہ واقعی ختم ہو جائے تو "جشن مسرت" منایا جائے کہ اچھا ہوا کہ یہ پابندی ختم ہوئی اور اس مصیبت سے نجات ملی؛ آخر یہ کیا تک ہے؟

اصل یہ ہے کہ اولین "مسلمانوں" کی مجاہدانہ اسپرٹ کے مظاہروں اور اسلام کی جاں فروشانہ فوجی معرکہ آرائیوں کو دبا کر تعلیمات اسلامی سے دوسری شکل میں مسلمانوں کو متعارف کرانا غیر مسلموں کی ایک باضابطہ سازش کا نتیجہ ہے۔ دشمنان اسلام چاہتے تھے کہ "مسلمانوں" کو جہد و عمل اور سعی و کاوش کی اُس منزل سے اتار کر جہاں "قرآن" کے ذریعے "محمدؐ" نے پہنچا دیا تھا، اس پست سطح پر لے آویں جہاں دیگر اہل مذاہب پہنچے ہوئے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس "جشن عید" کو جو اسلام کا عرش مقام پہلا سبق ہے وہ رنگ دے دیا۔ سنجو فرش پسند درس دون ہمتی ہے اور مسلمان اس سازش کا اس طرح شکار ہوئے کہ آج تک ہوش میں نہیں آ رہے ہیں! آیئے میں بتاؤں کہ "جشن عید" کیا ہے؟

مسلمانوں پر "روزہ" رمضان میں فرض ہوا اور پہلے پہل ۲ھ میں ابھی ماہ رمضان کے صرف چند دن گذرے تھے کہ بشارت الٰہی کے مطابق رسول اکرم اپنے تین سو تیرہ (۳۱۳) بیروان کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلے۔ نہ جنگ کا ارادہ تھا اور نہ اس کا موقع اور نہ اس کی صلاحیت، لہٰذا کوئی عسکری تیاری نہ تھی۔ کوئی فوجی استحکام عمل میں نہ آیا تھا مگر، ۱۷ رمضان ۲ھ

حالانکہ اور قومیں آج بھی روزہ رکھتی ہیں۔ پھر اگر واقعی "جشن عید" کا تعلق ذرہ برابر بھی "روزہ" کی ادائیگی سے ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا ذکر ضرور کرتا۔ قرآن نے "روزہ" کی تمام تفصیلات بہ وضاحت بیان کی ہیں مگر اس مقام پر کوئی لفظ ایسا نہیں جس میں اس فرض کی ادائیگی کے بعد کوئی "جشن عشرت" منانے کا اشارہ پایا جاتا ہو۔ پھر یوں بھی کسی "فرض" کی ادائیگی کا "جشن" کیا؟ "نماز" تو "روزہ" سے بھی اہم ہے اور بہت زیادہ صبر آزما۔ پھر جب "نماز" کی ادائیگی کے بعد اس کا کوئی "جشن" نہیں منایا جاتا یا نہیں منایا گیا تو "روزہ" کی کیا خصوصیت؟ "صحیح بخاری" کی روایت کے مطابق چوبیس ۲۴ گھنٹے کے دن رات میں پچاس وقت کی نماز فرض ہو گئی تھی۔ یعنی ہر ۲۹ منٹ پر ایک نماز۔ تاکہ دنیا میں کوئی انسان سوائے نماز پڑھنے کے اور دوسرا کوئی کام نہ کر سکے۔ کھانا، پینا۔ نہانا۔ دھونا کمانا، بال بچوں کو دیکھنا کچھ بھی نہیں۔ اس کو حضرت موسیٰ کی رہنمائی کے بعد رسول اللہ نے اللہ تعالےٰ سے کم کرا کے پانچ وقت کرایا۔ "جشن" تو اس کا منانا چاہیئے تھا؟ اس کو بھی چھوڑیئے۔ سال کے ۳۶۰ دنوں میں اگر تیس "روزے" رکھے جائیں تو اس کا "جشن" منایا جائے۔ مگر اب بھی اٹھارہ سو بار جو "نماز" پڑھی جائے اس کا کوئی "جشن" نہیں ایسا کیوں؟ آخر یہ "روزہ" کی پابندی کیا ایسی کڑی، ایسی نرالی اور ایسی کٹھن تھی یا ہے کہ مسلمان اس پابندی سے نجات پانے کے بعد اس کی خوشی میں "یوم نجات" یا "جشن مسرت" منائے؟ یا منائیں؟ پھر یہ عجیب لطف ہے کہ روزہ کے دنوں

محترز و مجتنب رہنا ہے۔ تقاضائے صیام، شان و نمائش نہیں بلکہ کسر نفسی و آزمایش ہے۔ نام و نمود نہیں بلکہ عجز و سجود ہے، پھیلنا نہیں بلکہ سمیٹنا ہے۔ ماہ رمضان ہوائے نفس کے علی الاعلان مظاہرات پر محاسبہ کی حیثیت رکھتا ہے اور فتح و کامرانی پر اظہار مسرت، سرکش نفس انسانی کی سب سے بڑی لذت تھی لہٰذا رسول اللہ اس کی اجازت کبھی نہ دے سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے "روزہ" کے فیوض اور "رمضان" کے قیود کا لحاظ کر کے اس کی اجازت نہ دی کہ مسلمان "رمضان" میں کوئی "جشن مسرت" فوراً منائیں۔ تا آنکہ اُدھر عربوں کے نفس کی بیتابیاں ختم ہو گئیں، ولولے سرد پڑ گئے اور خواہشات کا دریا اُتر گیا اور اِدھر رمضان المبارک ختم ہو کر "شوال"[1] کا چاند نکلا۔ شوال پہلے سے بھی عربوں کے نزدیک کیف و سرور اور مسرت و شادمانی کا مہینہ سمجھا جاتا تھا۔ اب جو شوال کا چاند طلوع ہوا تو اس کی صبح کو رسول اکرم نے مسلمانوں کو اجازت دی کہ اپنی یہ جائز خواہش پوری کر لو "جشن فتح بدر" منا لو۔ اس عظیم جنگ کامیابی اور پہلی عسکری فتح یابی کی شادی رچا لو چنانچہ مسلمان اذن عام پا کر "جشن مسرت" منانے نکلے۔ چونکہ اسلام اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ

---

[1] شوال "شول" سے مشتق ہے جس کے مصدری معنی برداشتہ شدن کے ہیں۔ چونکہ اس مہینہ میں عرب سیر و شکار اور تفریح و ہوا خوری کے لئے اپنے گھروں سے باہر چلے جایا کرتے تھے اس لئے اس مہینے کو "شوال" کہا جانے لگا۔ اس طور پر عربوں کے یہاں قبل از اسلام "شوال" کا مہینہ وصال سیر و تفریح اور بہجت و شادمانی کا مہینہ تھا۔

(۱۳ مارچ ۶۲۴ء) کو "معرکہ بدر" پیش آگیا۔ کافر و مومن، یزدان و اہرمن اور حق و باطل کا معرکہ گرم ہوگیا اور بالآخر مسلمانوں کی فتح کامل پر ختم ہوا۔ یہ اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی جو اسلام کے سب سے پہلے رمضان میں بڑے نامساعد حالات میں لڑی گئی تھی اور جس میں مسلمانوں نے انتہائی پریشان حالی و بے سروسامانی کے باوجود عجیب و غریب اور حیرت انگیز طریقے پر جبار و قہار ایک ہزار مسلح و مستعد دشمن پر فتح عظیم حاصل کی تھی۔ بالکل خلاف امید قطعاً خلاف توقع۔ یوں تو ہر کامیابی پر اظہار مسرت، نفس انسانی کی جبلی خواہش ہے، بالخصوص "جنگ" جیتنے پر ساری قدیم و جدید قومیں جشن مسرت منانی آئی ہیں اور منا رہی رہیں گی۔ پھر عرب تو ایسے جذباتی تھے جو معمولی معمولی جھڑپوں اور ادنیٰ ادنیٰ کامیابیوں پر فخر و مباہات کرتے تھے اور جشن مسرت منانے کے عادی تھے اور یہ تو اسلام کی سب سے پہلی جنگ تھی جس میں قیامت خیز بے سروسامانی کے باوجود مسلم مجاہدین عرب کو مشرکین پر فتح کامل حاصل ہوئی تھی۔ لہٰذا اُن کی فطری خواہش تھی کہ وہ اس "فتح عظیم" کا "جشن عظیم" منائیں اور ہر چند کہ یہ اُن کا جائز مطالبہ تھا مگر جس وقت یہ کامیابی ہوئی تھی وہ "رمضان" کا مہینہ تھا۔ جس میں مسلمانوں پر پہلے پہل "روزہ" فرض ہوا تھا اور "روزہ" کا اہم مقصد فخر و مباہات کرنا نہیں بلکہ اس سے بچنا ہے۔ نفس کی خواہشات پوری کرنا نہیں بلکہ اس کو دبانا ہے۔ جذبات کی رَو میں بہنا نہیں بلکہ اس کو قابو میں رکھنا ہے۔ تکبر و تبختر دکھانا نہیں بلکہ اُس سے کنارہ کشی کرنا ہے۔ لذتوں سے ہم کنار ہونا نہیں بلکہ اُس سے

اس طور پر رسول اللہ نے جنگ بدر کے "جشن" کے دن کو مسلمانوں کا اسلامی اور قومی دن بنا دیا۔ تاکہ مسلمانوں کے لئے یہ دن تاریخی اور اسلامی حیثیت سے ہمیشہ اہم بنا رہے اور اسلام کی فوجی اسپرٹ ختم یا سرد نہ ہونے پائے۔ جب "عید" آوے تو مسلمانوں کے سامنے اسلام کی سب سے پہلی جنگ کا نقشہ آجائے اور اُن کا لہو رگوں میں دوڑنے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ رمضان ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوا تو بھی آپ نے مسلمانوں کو فوراً کوئی "جشن" منانے نہ دیا۔ حالانکہ یہ فتح سب سے زیادہ اہم تھی کیونکہ اسی مرکز کے مغلوب ہونے پر سارا حجاز سرنگوں ہوگیا تھا۔ اس عظیم الشان فتح کا جشن بھی اسی پہلی شوال کو منایا گیا جس روز "جشن بدر" منانے کی مستقل تاریخ مسلمانوں کے لئے مقرر کردی گئی تھی۔ سنا آپ نے؟ یہ ہے "جشن عید"۔ یعنی یہ "عید" جو ہم مسلمان "پہلی شوال" کو ہر سال منایا کرتے ہیں۔ یہ اُس "جشن" کی یادگار اور سنت ہے جو پہلی شوال ۲ھ کو مجاہدین عرب نے اسلام کی سب سے پہلی جنگ میں ہر قسم کی بے سروسامانی کے باوجود فتح کامل حاصل کرنے کی خوشی میں منایا تھا اور اسی لئے اس کو "جشن عید" کہا جاتا ہے۔ یہ وہ سُنّت ہے جو ہر سال مسلمانوں کو معرکۂ بدر کی یاد دلاتا ہے۔ یہ وہ رسم ہے جو اس لئے قائم کی گئی تھی کہ مسلمانوں کا لہو اس دن گرم ہوجایا کرے۔ یہ وہ جشن ہے جو اسلام کی موت وحیات کے دن کی یاد دلاتا ہے:

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (میری نماز، میری عبادتیں، میرا مرنا، میرا جینا، سب کچھ صرف اللہ رب العلمین کے لئے ہے) کا فلسفۂ زندگی پیش کرتا ہے جس وجہ سے اسلام میں ہر کام خدا کے نام سے شروع کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ادنیٰ ادنیٰ کام بھی مسلمان "بسم اللہ" کہکر شروع کرتے ہیں۔ لہذا جب مسلمان "یہ جشن مسرت" یا "جشن بدر" منانے کو اکٹھا ہوئے تو آپ نے اس "جشن" کی ابتدا متعدد اسلامی نعروں اور کئی فوجی تکبیروں کے ساتھ دو رکعت نماز سے کی۔ آپ نے اور کسی نماز میں اس قدر تکبیریں دیکھی ہیں؟ یہ خاص طور سے "عید" کی نماز میں، اس لئے ہیں کہ یہ فوجی کامیابی اور عسکری فتح کے جشن مسرت کی نماز تھی۔ لہذا رسول اللہ نے بار بار اسلامی نعرہ لگایا اور چونکہ آپ کا یہ عام دستور تھا کہ جب کچھ لوگ کہیں پر اکٹھا ہوں تو انھیں اسلامی و اخلاقی تعلیمات سے باخبر و بہرہ یاب کریں۔ لہذا آپ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے دن بھر "جشن" منایا۔ بچے خوشی میں ناچے اور نوجوان عورتوں نے رسول اللہ کی اجازت سے دف پر گانا گایا۔

۳ھ کے بعد مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان مسلسل معرکۂ کارزار گرم رہا اور بجز جنگ اُحد کے کسی جنگ میں مسلمانوں کو ناکامی نہ ہوئی مگر کسی کامیابی پر انھیں فوراً "جشن" منانے کی اجازت نہیں دی گئی چاہے سال بھر میں جتنی مرتبہ بھی فتح ہوئی ہو بلکہ سب کا "جشن مسرت" اسی پہلی شوال کو منانے کی اجازت دی گئی۔ جس دن "فتح بدر" کا "جشن" منایا گیا تھا۔

تم کو اللہ کے لئے کیا کرنا چاہئے۔

یہ وہ اسلامی دن ہے جس دن عرشِ الٰہی سے مسلمانوں کو آواز دی جاتی ہے کہ:۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ ۳)

"اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تمکو اندیشہ ہے اور وہ گھر جو تم کو بہت پسند ہیں، یہ سب خدا سے اور اس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہیں تو پھر تم منتظر رہو کہ اللہ تمہارے لئے اپنا حکم صادر کردے۔"

بہرکیف اسلام میں "عید" اس لئے رکھی گئی تھی جس عید اسلئے قائم کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ سے جنگ بدر اوجھل نہ ہونے پائے اور اُن کے خون میں ہر سال اتنی گرمی قائم رہے کہ جب دنیا میں مظلوم، اُن کو اپنی مدد کے لئے پکاریں تو وہ لبیک کہکر دوڑ پڑیں۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ

"اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کرو اور اُن کمزور مردوں کی مدد کو نہ دوڑو جن میں کچھ مرد، کچھ

عید آزاداں ، شکوہ مُلک و دیں (اقبال)
عید محکوماں ، ہجوم مومنیں

"یہ جشن عید" مسلمانوں کو جہد و عمل کا یہ سبق دیتا ہے کہ :-

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ (توبہ ۲)

"کیا تم لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیئے جاؤ گے ؟ حالانکہ ابھی اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں ہے جنھوں نے تم میں سے جہاد کیا ہو؟"

یہ "عید" وہ اسلامی تاریخ ہے جس دن اللہ تعالےٰ مسلمانوں سے پوچھتا ہے کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ (توبہ ۷)

"اے مسلمانو! آخر تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکل پڑو تو تم یہ سُن کر زمین میں دھنسے جاتے ہو؟ کیا تم نے واقعی آخرت کے عوض اسی دنیاوی زندگی پر ہی قناعت کر لی ہے ؟"

"یہ جشن عید" یا "جشن بدر" ہر سال مسلمانوں کو للکارتا ہے کہ :-

تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا (سبا ۶)

اُٹھ کھڑے ہو۔ دو ہو تو دو ہی سہی ایک ہو تو ایک ہی سہی اور پھر سوچو کہ

مُشرک

اندھیری شب ہے، جُدا اپنے قافلے سے ہے تو
ترے لئے ہے، مرا شعلۂ نوا، قندیل (اقبال)

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ۔ (ھود ۸)

"میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا کہ جہاں تک میرے بس میں ہے اصلاح حال کی کوشش کروں۔ میرا کام بننا ہے تو اللہ ہی کی مدد سے بننا ہے میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کی طرف رجوع ہوں"

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اُخوّت کی جہانگیری، محبّت کی فراوانی
بُتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا
نہ تُورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
(اقبال)

ایک نقطہ وہ ہے "واحد خدا" کو اپنا معبودِ مطلق قرار دینے والی قومیں اور

وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ
الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ
لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا
وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ
نَصِيْرًا (نساء ۱۰)

عورتیں اور کچھ بچے دعا کر رہے ہیں کہ
اے پروردگار ہم کو اس بستی سے باہر
نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں
اور ہمارے لئے غیب سے کسی کو
ہمدرد اور دوست بنادے اور ہمارے
لئے غیب سے کسی کو مدد کے لئے بھیج۔

لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال ۶)

"خبردار! تم لوگ آپس میں لڑنا جھگڑنا مت۔ ورنہ کمزور ہو جاؤ گے اور لوگوں پر سے تمہاری دھاک اٹھ جائیگی"

ہمیں بتا تو دیا گیا تھا۔ تنبیہ تو کر دی گئی تھی کہ:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ... وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (آل عمران ۱۱)

"دیکھو تم لوگ اللہ کی رسّی (قرآن) کو مل کر کے مضبوطی سے پکڑے رہنا اور تم میں اختلاف و افتراق نہ ہونے پائے .... اور دیکھو تم لوگ بھی اُن قوموں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اللہ کی طرف سے ہدایت نامہ اور واضح احکام آجانے کے بعد بھی آپس میں تفریق کر لی اور باہم اختلاف کرنے لگے۔ یاد رکھو کہ ہم ایسا کرنے والوں کو بڑی ہی دردناک سزا دیا کرتے ہیں"

اعلان تو کر دیا گیا کہ یہ قرآنی ہدایات اور خدائی احکام ہیں اور مَا هُوَ بِالْهَزْلِ "یہ ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے"۔ مگر ہمارے یہاں اسے "ہنسی ٹھٹھا" ہی سمجھا گیا۔

"حبل اللہ" کو ناکافی، منسوخ، محتاج، محکوم قرار دیا گیا اور نہایت سختی سے، کوشش کر کے، بڑی تندہی کے ساتھ بڑے بڑے علماء کی قیادت میں مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ فروعات اور جزئیات کو لے لے کر الگ الگ جماعتیں بنائی گئیں۔ گروہ بندی کی گئی۔ اسلام

متعدد نقطوں میں منقسم؟ منتشر قبائل کو ایک چادر پر مجتمع اور مختلف ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینے والے رسول کی اُمّت خود پارہ پارہ؟ ایک مجلّد و شیرازہ بند "قرآن" کو "دستور العمل" اور "آئین زندگی" مان کر صبح و شام تلاوت کرنے والوں کی تین تین "اہل"[1] "جماعت"؟ اور اس قدر "اہلیت" کے باوجود وہ قوم اس قدر زبوں حال و پست اخلاق؟ اتنی مردود و مقہور؟ ایسی مفلس و قلاش؟ اس طرح حیران و سرگرداں؟ —— ان سوالات کا جواب ایک اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ —— ہم نے "قرآن" کو نظر انداز کر دیا تو خدا نے ہم کو —— یہ تو بدلہ کی دنیا ہے:۔

(۱) لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ (حج ۶) "اللہ تو اسی کی مدد کرے گا جو اللہ کی مدد کرے گا"

(۲) اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (بقرہ ۵) "تم لوگ اپنے عہد کو پورا کرو گے تو میں اپنے عہد کو پورا کروں گا"

(۳) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ (بقرہ ۱۸) "جب تم مجھ کو یاد رکھو گے تو میں تم کو یاد رکھوں گا"

(۴) نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ (توبہ ۹) "انھوں نے اللہ کو فراموش کر دیا تو اللہ نے اُن کو فراموش کر دیا"

ہمیں سمجھا تو دیا گیا تھا تاکید تو کر دی گئی تھی کہ:۔

---

[1] "اہل سنت" "اہل تشیع" "اہل حدیث" "اللہ اللہ" "اہلبیت" کی کوئی حد ہے؟

مگر ہم خدا کے تابعدار اور فرمانبردار (مسلمان) بندے اُس حکم پر یوں عمل کر رہے ہیں کہ یہ سُنکڑا ہے اور وہ رافضی ؟ ۔ یہ وہابی ہے اور وہ مودودیہ ۔ یہ جلاہا ہے اور وہ مہتر ۔ یہ قصائی ہے اور وہ کُنجڑا یہ سیّد ہے اور وہ شیخ ۔ یہ نجیب الطرفین ہے اور وہ حرامزادہ ۔ یہ بہاری ہے اور وہ بنگالی ۔ اب یہ کس کی مجال ہے کہ ان عزّت والوں خدا کے لاڈلوں سے پوچھے کہ : ۔

تُم سبھی کچھ ہو بتاؤ کہ "مُسلمان" بھی ہو ؟

اگر "مسلمان" ہو اور "قرآن" کی تلاوت کرنے والے ۔ اگر تم دلدادۂ سُنّت ہو جس کی سُنّت قبائل عرب کو ملا دینا ہے ۔ اور اُس رسول کے ماننے والے ہو جس نے اپنی معزز ترین "چچیری بہن" کی شادی ارذل ترین "غلام" سے کر دی تھی تو بتاؤ کہ یہ نسبی و نسلی تفریق کیسی ؟ یہ فروعی و جزئی مسائل پر گروہ بندی کہاں سے ؟ یہ طبقاتی و معاشرتی تقسیم کیا ؟ اسلام تو انسانیت کا پیام ہے ۔ آفاقیت کا حامل ہے ! اس میں تو کسی طرح کی بھی ، کسی عنوان سے بھی ، فرقہ بندی و گروہ سازی جائز ہی نہیں ہے ۔ یہاں تو ٹولیاں ، بنانا ، پارٹی مرتب کرنا "حرام" ہے ۔ میں نے تو "حرام" ہی کہا ہے تاکہ ذرا سا جُرم ہلکا نظر آئے اور اللہ تعالےٰ کے یہاں معافی کی گنجائش رہے ورنہ "قرآن" نے تو "گروہ بندی" اور "جماعت سازی" کو "شرک" کہا ہے اور شرک ایک ناقابل معافی جُرمِ عظیم ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ "اللہ شرک کو تو کبھی معاف نہ کرے گا ۔ ہاں

کے قومی ہیکل مجسمے کو گولی مار کر گرایا گیا اور پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا گیا۔ اس کی بوٹیاں بوٹیاں علیحدہ کر دی گئیں۔ پھر جو حشر ہو وہ کم ہے جو سزا ملے وہ جائز ہے۔

ذرا سوچیے تو خدا کو "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" رسول کو "رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ" اور قرآن کو "ذِکْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ"۔۔۔ ماننے اور کہنے والی آفاقی مسلمان قوم "غیروں" کو کیا اپنائی کہ وہ اپنوں کو بھی آج تک اس طرح کاٹ رہی ہے، الگ کر رہی ہے گویا وہ کسی دوسرے خدا کے بندے، کسی دوسرے رسول کی امت اور کسی دوسری کتاب کے تلاوت کرنے والے ہیں۔ کیا تماشا ہے کہ "رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ" تو "رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ" کا پیغام یہ پہنچائیں کہ:۔

(۱) لَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (حجرات ۲)

"تم لوگ نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو بُرے لقب سے پکارو۔ ایمان لے آنے کے بعد گناہ کا نام لگنا بھی بُرا ہے اور جو لوگ اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئیں گے ان کا شمار ظالموں میں کیا جائے گا۔"

(۲) اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات ۲)

"اللہ کے نزدیک تو سب سے بڑا شریف، معزز اور بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرے۔"

"دین" میں تفرقہ اندازی کر کے مختلف ٹولیوں میں بٹ جائیں وہ تم میں سے نہیں ہیں۔ رسول اکرم سے خطاب ہوتا ہے اور قیامت تک کے لئے فیصلہ سنا دیا جاتا ہے کہ :-

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ	"جو لوگ اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گروہ گروہ
وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ	بن جائیں ٹولیوں ٹولیوں میں بٹ جائیں ان کا کسی معنی کر
فِیْ شَیْءٍ ؕ اِنَّمَآ اَمْرُهُمْ	تم سے کوئی تعلق نہیں۔ اُن کا معاملہ
اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمْ بِمَا	اللہ کے حوالہ ہے۔ پھر وہ اُن کا کیا ہوا
كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ (انعام ۲۰)	اُن کو جتلا دے گا۔"

اور سُنئے ـــ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر جانے لگے تو انھوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا کے بنی اسرائیل کے پاس چھوڑ دیا۔ اس درمیان میں سامری کی سازش سے بنی اسرائیل نے گمراہ ہو کر "گوسالہ پرستی" شروع کر دی۔ حضرت ہارون علیہ السلام نے فرض رسالت کی ادائیگی میں قوم کو اس "شرک" سے باز رکھنے کی امکانی کوشش کی مگر اُن کی ایک نہ چلی بلکہ قوم نے انھیں قتل ہی کر دینے کی دھمکی دے دی۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام وحی الٰہی کے ذریعے، بنی اسرائیل کی گمراہی سے باخبر ہو کر واپس لوٹے اور انھوں نے حضرت ہارونؑ سے سختی کے ساتھ باز پرس کی کہ تو نے انھیں روکا کیوں نہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم نے روکا تو بہت مگر زیادہ سختی اور تشدد اس لئے نہ کیا کہ :-

بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا (نسآء)

اس کے سوا اور جو دوسرے گناہ ہوں اُن میں سے جن کو منظور ہوگا معاف کر دے گا کیونکہ جس نے شرک کیا اس نے بڑا بھاری جرم کیا۔"

بھولے مسلمانوں نے صرف "بُت پرستی" یا زیادہ سے زیادہ "تعزیہ پرستی" اور "قبر پرستی" کو "شرک" قرار دے رکھا ہے۔ اب آیئے ذرا دیکھئے کہ "دین" کے معاملے میں تفریق کر کے ٹولیوں ٹولیوں میں بٹ جانے کو اللہ تعالیٰ نے کس قدر واضح طور پر "شرک" قرار دیا ہے:۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم ۴)

"دیکھو تم لوگ خدا کی طرف رجوع رہ کر فطرت الٰہیہ کی پیروی کرنا اور اس سے ڈرنا اور نماز کی پابندی رکھنا اور اُن شرک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر لیا ہے اور بہت سے گروہوں میں بٹ بٹ گئے ہیں اور ہر گروہ اپنے اُن اعتقادات پر خوش ہے جنھیں وہ لئے بیٹھا ہے۔"

للہ غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ "مشرکین" اُن کو کہا گیا ہے جنھوں نے تفرقہ اندازی کر کے اپنی اجتماعیت کھو دی تھی اور اپنے کو مختلف گروہوں میں بانٹ لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ جو لوگ

ٹولیوں میں بٹ بٹ کے اپنی اجتماعیت کھو دیں ۔ بے موقعگی کے وقت "وحرام" میں کمتر کو ترجیح دیجاتی ہے "۔ گوسالہ پرستی" بھی "شرک" تھی اور "تفرقہ اندازی" بھی لازماً "شرک" مگر چونکہ "گوسالہ پرستی" کے "شرک" کو عارضی طور پر گوارا کر لینے میں قوم کی "اجتماعیت" باقی اور قائم رہتی تھی ۔ لہٰذا حضرت ہارون نے اس چھوٹے شرک کو تو گوارا کر لیا مگر "تفرقہ" اور "پھوٹ" کے "بڑے شرک" کو پسند نہ کیا ۔ سوچئے تو کہ اللہ تعالیٰ افسانہ گو ہے جو اس نے اپنی اس عظیم الشان کتاب اور "ہمارے دستور العمل" میں اس قصے کو بیان کیا ہے "تفرقہ" کے ہولناک ہونے ہی کے سبب اگرچہ قرآن نے "قتل" کو بھاری جرم قرار دیا ہے :۔

مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	"جو شخص قصداً کسی مومن کو قتل کر دیگا
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا	وہ سیدھا جہنم میں جائے گا ۔ جس میں
وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ	وہ ہمیشہ رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب
وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا	بھی ہوگا اور لعنت بھی اور اس کے لئے
(نساء ۱۳)	عذاب عظیم ہے "

مگر "فتنہ انگیزی" کو "قتل" سے بھی بڑا اور بھاری جرم قرار دیا ہے :۔

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ	"فتنہ انگیزی تو قتل سے بدرجہا بڑھ کر
(بقرہ ۲۴ و ۲۰۷)	جرم ہے "

ایسا اس لئے ہے کہ "قتل" تو انفرادی طور پر جراحت رساں ہے "فتنہ انگیزی" سے "اجتماعیت" کے مجروح اور متاثر ہونے اور قوم کی قوم کے تباہ و برباد ہونے کا اندیشہ ہے ۔ لہٰذا اسلام نے "قتل" سے بھی بھاری جرم

اِنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ	"میں اس بات سے ڈر گیا کہ کہیں آپ یہ
بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ	نہ فرمانے لگیں کہ تو نے بنی اسرائیل میں
تَرْقُبْ قَوْلِیْ (طٰہٰ ۵)	تفرقہ اور پھوٹ ڈال دی اور میری بات
	کا پاس نہ کیا۔"

ذرا غور کیجئے حضرت ہارون پیغمبر تھے حقِ رسالت ادا کرنے میں جان جانے سے بھی نہ ڈرے۔ مگر ڈر گئے کس چیز سے؟ اُن کے اس جواب پر غور کیجئے۔ قرآن بار بار دعوتِ فکر و تامل اور غور و تدبر دیتا ہے:۔

(۱) اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ	"اس میں سبق ہے اس قوم کے لئے
یَّتَفَکَّرُوْنَ (نحل ۲)	جو غور و فکر کرے۔"
(۲) کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ	"ہم کس کس طرح مختلف پہلوؤں سے
لَعَلَّھُمْ یَفْقَھُوْنَ (انعام ۹)	بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔"

آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ کسی قوم میں اختلاف و انتشار اتنا بڑا تباہ کن جرم اور افتراق و تشتت اتنی بڑی ہولناک لعنت ہے جسے "شرک" قرار دیا گیا ہے۔ قوم کو اس افتراق و انشقاق سے بچانے کے لئے ٹولیوں ٹولیوں میں بٹنے اور گروہ گروہ بننے سے محفوظ رکھنے کی خاطر حضرت ہارونؑ نے "گوسالہ پرستی" کے "چھوٹے شرک" کو تو عارضی طور پر منظور کر لیا۔ مگر قوم کے ٹولیوں ٹولیوں میں بٹ جانے کے "بڑے شرک" کو پسند نہ کیا۔ انھوں نے "گوسالہ پرستی" کو روا رکھ لیا مگر یہ نہ گوارا کیا کہ قوم میں پھوٹ پڑ جائے اور لوگ متفرق و مختلف

کی اہمیت کس قدر ہے اس کا اندازہ یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس وقت "ملت ابراہیمی" ختم الانبیاء کی معرفت "اسلام" کا لقب اختیار کر کے آئی تو باوصف اس کے کہ "اہل کتاب" تمام تر "آل ابراہیم" تھے اور "ملت ابراہیمی" ہی کے حامی تھے۔ مگر انھوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی اور اسلام، محمد اور قرآن سب کو ماننے سے انکار کر دیا حالانکہ نہ صرف یہ کہ اس "نبی امی" کی آمد کی خبر تمام سابقہ کتابوں میں پہلے ہی دیدی گئی تھی جس سے وہ باخبر تھے بلکہ اسلام "ملت ابراہیمی" ہونے کے سبب تمام اہل کتاب کی تصدیق بھی کر رہا تھا۔ اس موقع پر دیکھئے کہ "اجتماعیت" قائم کرنے کے لئے بیک وقت۔ ایک طرف تو "اہل کتاب" کو سمجھایا اور سمجھایا گیا کہ :-

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي	"اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں حجت
إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِ	کیا کرتے ہو جبکہ توراۃ اور انجیل سب ان کے
نجِيلُ إِلَّا مِن بَعْدِهِ (آل عمران)	بعد نازل ہوئی ہیں؟"

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا	"ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ
وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا (آل عمران)	صراط مستقیم والے مسلمان یعنی تابع فرمان بندے تھے"

یعنی آل ابراہیم ہوتے ہوئے بھی تم لوگوں نے یہودیت و نصرانیت کی نسبتوں سے جو فرقہ سازی اور گروہ بندی کر لی ہے اور مختلف ٹولیوں میں تم لوگ بٹ بٹ گئے ہو اس کو ملت ابراہیمی سے کیا تعلق؟ تم لوگ اتنی موٹی سی بات پر غور نہیں کرتے کہ توراۃ و انجیل، جن کی نسبتوں سے تم لوگوں نے یہ تقسیم

"فتنہ انگیزی" کو قرار دیا کیونکہ اس میں "تفرقہ اندازی" کا پورا پورا اندیشہ ہے۔ حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام سبھوں کو یہی حکم تھا کہ "دین" میں "اجتماعیت" کو قائم رکھنا اور قوم کو ٹکڑوں ٹکڑوں اور ٹولیوں ٹولیوں میں نہ بٹنے دینا:۔

وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۲)	"اور ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی بجز اس کے اور کچھ نہ کہا تھا کہ دیکھو دین کی اجتماعیت قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ اندازی نہ ہونے پائے۔"

اور یہ سب ہوتا کیوں ہے؟

مَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (شوریٰ ۲)	"اور وہ لوگ اس کے باوجود کہ علم الٰہی ان کے پاس پہنچ چکا تھا محض آپس کی ضد اضدی سے متفرق و منتشر ہو ہو گئے۔"

بتایا تو سب کچھ گیا ہے سمجھایا گیا تو طرح طرح سے اور بہت کچھ مگر ہمارے نزدیک تو سب کچھ مذاق ہے۔ ہمارا رویہ تو کافرانہ ہے۔ ہم کو جو کچھ آتا ہے یا ہم نے اس سے جو کچھ سیکھا وہ مشرکانہ انداز یہاں تک کہ ان قصوں کو بھی، کافروں کی طرح یہ کہہ کر کے طاق پہ دھر دیا کہ:۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (انفال ۴)	"یہ تو کچھ نہیں یہ تو وہی قصے ہیں جو اگلوں سے تفریحاً منقول ہوتے چلے آتے ہیں۔"

اسلام کا دوسرا نام "ملت ابراہیمی" ہے اسلام میں "اجتماعیت"

نکتہ اے ہمدم فرزانہ بیں — شہد را در خانہ ہائے لانہ بیں
قطرۂ از لالۂ حمرا ستے — قطرۂ از نرگس شہلا ستے
ایں نمی گوید کہ من از عبہرم — آں نمی گوید من از نیلوفرم
ملت ما شانِ ابراہیمی است — شہد ما ایمان ابراہیمی است
نیست از روم و عرب پیوند ما — نیست پابند نسب پیوند ما
دل بہ محبوب حجازی بستہ ایم — ریں جہت با یکدگر پیوستہ ایم

یعنی جس طرح مدھ مکھی کے چھتہ کے خانوں میں مختلف اور متفرق قسم کے پھولوں کا رس پہنچتا ہے کوئی قطرہ لالۂ احمر کا ہوتا ہے اور کوئی نرگس شہلا کا۔ مگر چھتہ میں پہنچ جانے کے بعد پھر کوئی قطرہ یہ نہیں کہتا کہ میں فلاں ہوں اور میں فلاں بلکہ وہ سب قطرے باہم گھل ملکر شہد بن جاتے ہیں اسی طرح ہماری یہ ملت ابراہیمی بھی "ابراہیمی چھتہ" ہے اور ہمارا ایمان ابراہیمی شہد ہے لہذا اسلام میں داخل ہوجانے کے بعد نہ تو زمین و وطن کی کوئی مغائرت و تفریق باقی رہتی ہے اور نہ رنگ و نسل کی کوئی گنجائش۔ بلکہ ہم ایک رسوا کی امت ہونیکے سبب ایک دوسرے سے پیوستہ ہوکر وہ نہیں رہتے جو ہم پہلے تھے بلکہ ایک ایک دوسری ہی چیز بن جاتے ہیں جو شہد کی طرح لذیذ، خوش رنگ اور مفید ہوتے ہیں۔

اب سوچئے تو کہ ہماری کیا حالت ہے؟ حضرت ہارون نے اپنی قوم کی اجتماعیت باقی رکھنے اور انکو بڑے "شرک" کا مرتکب ہونے سے بچانے کیلئے انکی گوسالہ پرستی کو وقتی طور پر گوارا کر لیا تھا۔ مگر ہم فروعات کے ایک شوشے میں بھی اختلاف کو گوارا کرکے اپنی اجتماعیت واپس لوٹانے کو آمادہ نہیں؟ ہم ابراہیمی چھتہ" میں رہ کر بھی "شہد" بننے کیلئے تیار نہیں بلکہ اس چھتہ کے مختلف خانوں میں بے مصرف پڑے ہوئے

وتفریق کرلی ہے حضرت ابراہیم کے بعد نازل ہوئی تھیں ؛ ابراہیم نہ تو یہودیت کی نسبت رکھتے تھے اور نہ نصرانیت کی وہ تو خدا کے سیدھے سادے راستے پر چلنے والے فرمانبردار بندے تھے ۔ دوسری جانب رسول اکرم کو بھی حکم دیا گیا کہ کلمۃ نہ سہی جس کم سے کم بات پر بھی ممکن ہو تم اسکو قبول کر کے اہل کتاب سے اتحاد و اتفاق پیدا کرو اور اجتماعیت قائم کرلو۔ تم انھیں دعوت دو کہ اچھا اور کچھ نہ سہی مگر ایک چیز تو ہمارے اور تمہارے درمیان یقیناً ایسی ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ؟ یعنی خدا ؟ یہ تو ایسا نقطہ ہے جسے ہم اور تم سب ہی مانتے ہیں ؟ لہٰذا آؤ ہم سب اہل کتاب اسی ایک بات پر اتفاق کرلیں :

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران)

"تم کہو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک اور متفق علیہ ہے ۔ وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کریں گے اور اللہ کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی خدا کو چھوڑ کر غیر خدا کو اپنا رب قرار نہ دے[1]"

ذرا دیکھئے تو کہ قرآن کس کس طرح ہم مسلمانوں کو تعلیم دے رہا ہے کہ کسی نسبت سے کوئی گروہ سازی، جماعت بندی مناسب نہیں بلکہ سب مسلمان کم سے کم بھی جتنی باتوں میں ممکن ہو، اتفاق کر کے باہم متحد و ہم رائے ہو جائیں ۔ علامہ اقبال نے ملت ابراہیمی کی اس خصوصیت کو ایک جگہ بڑے دل پسند انداز سے اپنے اشعار میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں :

---

[1] ارباب شریعت ، ارباب طریقت ، ارباب سیاسیت وغیرہ کا قرآن کے خلاف کوئی حکم ماننا ، ارباباً من دون اللہ کی عبادت (فرمانبرداری) کرنا ہے

پیغمبروں کی بعثت اور کتابوں کے نزول کا منتہائے مقصود صرف یہ تھا کہ اختلاف مٹ جائیں اور سارے خدا کے بندے باہم متحد و متفق خیال ہو جائیں۔ اس لئے قرآن ہر جگہ رسول و کتاب کی آمد کے بعد اختلاف و افتراق کو کفر قرار دیتا ہے۔ ناراضی و ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے:۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا	"اور اہل کتاب نے اس حالت میں اختلاف
الْكِتٰبَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ	کیا کہ ان کو دلیل پہنچ چکی تھی بعض ایک دوسرے
الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ وَمَنْ	کی ضد میں اور جو شخص خدا کی آیات پہنچ جانے
يَكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَإِنَّ اللّٰهَ	کے بعد کفر کرے گا تو اللہ اس کا جلد ہی
سَرِيعُ الْحِسَابِ (آل عمران ۲)	حساب لینے والا ہے۔

ہمارا دین اسلام وہی "دین" ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تھا۔ حضرت ابراہیم نے کافروں، مشرکوں اور بے دینوں یا بت پرستوں کے بارے میں فرمایا تھا:۔

يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَيَلْعَنُ	"تم میں ایک دوسرے کو کافر کہے گا اور ایک
بَعْضُكُمْ بَعْضًا (عنکبوت ۳)	دوسرے پر لعنت بھیجے گا"

بقول حضرت ابراہیم اور قرآن "یہ کام کافر" سب قیامت کے دن کریں گے مگر "تم مومن" آج اسی دنیا میں یہی کام کر رہے ہیں:۔

وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا	"حالانکہ تم کتاب کی تلاوت بھی کرتے رہتے
تَعْقِلُونَ (بقرہ ۵)	ہو پھر کیا تم کو اتنی بھی عقل نہیں؟"

آنحضرت صلعم کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ تمام اہل کتاب سے "اتفاق" کر کے "اتحاد" پیدا کریں اور اجتماعیت بنائیں اور اسکے لئے بتایا گیا کہ کم از کم ایک بات

صرف چیخے چلے جا رہے ہیں کہ ہم فلاں ہیں اور ہم فلاں! ہم کو ذرا ہوش نہیں آتا کہ ہم نے کتنے بڑے "شرک" کو تسلیم کر کے اور اس کی سزا میں اپنی اجتماعیت کو ختم کر کے نفاق کی مردہ لاش کو گلے لگا لیا ہے اور خوش ہیں کہ ہم "صراط مستقیم" پر ہیں؟ ہماری سمجھ میں کسی وقت یہ نہیں آتا کہ ہم ابراہیمی چھتہ میں پڑے ہوئے نہ "شہد" بن رہے ہیں کہ دوا یا غذا میں بنی نوع انسان کے لئے مفید ہوں اور نہ الگ رہ کر ہی کوئی ایسا جوہر بن رہے ہیں جس کی کوئی قیمت ہو؛ بلکہ قطرہ قطرہ الگ رہ کر خود بھی بے مصرف و بے حقیقت ہو رہے ہیں اور معزز چھتہ کو بھی رسوا اور بدنام کر رہے ہیں کہ اس میں کچھ نہیں یہ صرف نمائشی ہے! ٹھیک کہا ہے قرآن نے کہ:۔

وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُونَ (یوسف ۱۰۶) "اور اکثر لوگ جو خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ شرک بھی کرتے جاتے ہیں"!

کتنا عرصہ ہوا کہ اقبال نے پیغام دیا تھا مگر کسی نے بھی توجہ دی! کس درد و محبت سے اس نے پکارا تھا کہ:۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہوں یا اعرابی والا گہر

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اے کہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش

هُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ وَكَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ (بقرہ ۱۴)

بھی پڑھتے ہیں۔ یہ تو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے وہ بات کرے جو کچھ جانتا ہی نہ ہو۔"

وہ ایسا کیوں کرتے تھے؟ محض ایک دوسرے کی ضد میں۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ (جاثیہ ۲)

"اور ہم نے اُن کو "دین" کے سلسلے میں واضح احکام دیئے تھے مگر انھوں نے علم ہوتے ہوئے بھی محض آپس کی ضد اضدی میں اختلاف پیدا کر لیا۔"

خدارا انصاف کیجئے کہ کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرا تو نہیں رہی ہے؟ کیا قرآن کو ماننے اور پڑھنے کے باوجود محض آپس کی ضد اضدی میں مسلمانوں کا ایک فرقہ دوسرے کو برا نہیں کہہ رہا ہے۔ پھر یہود و نصاریٰ اور مسلمان میں کیا فرق رہا؟ آخر قرآن کو گھر میں رکھنے، ماننے اور پڑھنے کا حاصل؟

برمنگھم کے ایک حکیم کا جلیل القدر فرزند آقا حسین کاظم مدیر رسالہ "ایران شہر" اکابرین ایران میں سے ہے۔ وہ قسطنطنیہ میں ایرانی قونصلیٹ کا سکریٹری رہ چکا ہے۔ لندن میں السنۂ شرقیہ کا پروفیسر رہ چکا ہے۔ پچاسوں کتابوں کا قابل قدر مصنف ہے۔ اسکے رسالہ "ایران شہر" کی پالیسی کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ:-

"ہم کو شہد کی مکھیوں کی طرح مختلف کلچر کے پسندیدہ عناصر کو اپنا لینا چاہیئے۔"

اس مدیر و مصنف کا ایک قول سُنئے:-

"میرا فریضہ جو مجھ پر عاید کیا گیا ہے یہ ہے کہ بلا اظہار تعصب و رعایت

تو سب اہل کتاب کے نزدیک متفق ہے۔ یعنی "خدا"۔ لہٰذا اسی ایک نقطے پر سب لوگ متفق ہو جائیں۔ اب غور کیجئے۔ ہمارے یہاں :-

خدا رسول قرآن

تین تین نقطے ایسے ہیں جن پر سارے مسلمان اتفاق کامل رکھتے ہیں۔ پھر کیا تمام فرقے باہم متفق نہیں ہو سکتے؟ اللہ تعالیٰ نے تین اہل کتاب (یہودی عیسائی اور مسلمان) کو ایک نقطہ (خدا) پر مجتمع و متحد الرائے ہو جانے کو کہا تھا اور ہم تین تین مرکز (خدا، رسول، قرآن) کے ہوتے ہوئے بھی ایک رائے اور متفق الخیال نہیں ہو سکتے؟ رسول اللہ نے صرف ایک متفقہ بات پر کہ خدا کے سوا کسی کی پرستش نہ کی جائے۔ غیروں کو دعوت اتحاد دی تھی مگر ہم اپنوں کو بھی خود سے علیحدہ کر رہے ہیں اور چھانٹے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے درمیان تین تین باتیں ایسی ہیں جن پر سب کا اتفاق ہے؟ رسول کو ہمارے لئے "نمونہ" بتایا گیا ہے۔ پھر کیا اس نمونے سے ہم ایک بات کا بھی سبق نہیں لے سکتے؟ کیا ہم اسی لئے دنیا میں ہیں کہ کتوں کی طرح محض ہڈی کے لئے زندگی کے لمحات آپس میں لڑ لڑ کر گنوا دیں؟ قرآن چیخ رہا ہے۔ گرج رہا ہے، ڈانٹ رہا ہے کہ ایک دوسرے کو برا کہنا اور سمجھنا یہودیوں اور عیسائیوں کا شیوہ ہے مسلمانوں کا وطیرہ نہیں :-

قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى	"یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ بے راہ ہیں
عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى	اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود بے راہ ہیں
لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ	اور لطف یہ ہے کہ دونوں اللہ کی کتاب

"اجنبی"

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ ولیکن
ارباب نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز (اقبال)

افسر العلما حضرت علامہ ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور کتاب "ترجمان القرآن" کو ایک اُس فرشتہ صفت گمنام شخص کے نام معنون کیا ہے جو بہت لمبا سفر طے کر کے قرآن کی ایک آیت اُن سے سمجھنے کے لئے آیا تھا اور میرا یہ مضمون اس اجنبی کی یاد کو محفوظ رکھنے کے سلسلے میں ہے جو نہ جانے کہاں سے آکر مجھے قرآن کی ایک آیت سمجھا گیا۔

ایک صاحب چند دنوں سے میری جانب ملتفت تھے۔ مگر میں نے اُن کی طرف توجہ نہ کی تھی۔ ایک دن میں نے سوال کیا: "آپ میری جانب کئی دنوں سے مخاطب ہیں مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہوں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" اُنھوں نے فرمایا: "ذرا بتائیے کہ اس آیت کا مفہوم کیا ہے؟"

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ — "اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ — ہے کہ خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک

حقیقت وصداقت کو عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہر مذہب ایک مخصوص رسالت کی تبلیغ کا ذمہ دار ہوتا ہے :۔

(۱) برہمن کا دھرم	"حکمت"
(۲) زرتشتی مذہب	"خلوص"
(۳) موسوی دین	"استقامت"
(۴) بدھ مت	"شفقت"
(۵) عیسائیت	"ایثار"
(۶) اسلام	"اتحاد"

کی تلقین کرتا ہے جس طرح روشنی سات مختلف رنگوں میں منقسم ہوتی ہے اسی طرح مستقبل کے ذمہ بنی نوع انسان کو ایک ساتویں مذہب کا پیش کرنا لازم ہے جس کا نام "اتفاق" ہے"۔

غور کیجئے کہ یہ ایرانی کتنا اونچا گیا ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کو "اتفاق" کی دعوت دیتا ہے اور اسلام کی خصوصیت محض "اتحاد" بتاتا ہے۔ مگر ہم "مسلمان" "اتحاد" کو "کفر" سمجھتے ہیں اور "اختلاف" کو "اسلام" سمجھے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ از روئے قرآن وہ "شرک" ہے۔ نرا "شرک"۔ سراسر "شرک" لہذا آج جو "مسلمان" اختلاف رکھتا ہے وہ اپنے کو "مسلم" غلط کہتا ہے۔ وہ "مشرک" ہے نرا "مشرک" !!

"اسلام کی دعوت دیتا ہو، قرآن وحدیث کی طرف لوگوں کو بلاتا ہو۔ نیک کام کرنے کی ہدایت کرتا ہو اور بدکاری سے روکتا ہو۔ یہ مبلغین داعیان اسلام اور واعظان توحید کا گروہ ہی یقیناً آخرت میں کامیاب ہونے والا ہے۔ اس آیتہ کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہمیشہ ایک گروہ اُن میں ایسا رہے جو امر بالمعروف۔ اور نہی عن المنکر کرتا رہے۔ اسی کا نام فرض کفایہ ہے۔ الحمدللہ کہ علماء وطلباء ایک جماعت سے یہ فرض ہمیشہ ادا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ادا ہو رہا ہے۔ اور یہ گروہ تمام مسلمانوں کو اس فرض سے سبکدوش بنا رہا ہے۔ نیز مشائخ حق کا گروہ بھی بدرجہ اتم انجام دیتا رہا اور اب بھی انجام دے رہا ہے۔"

(صفحہ ۶۷۸)

میرا مخاطب "اجنبی" یہ سنکر کہنے لگا:۔

"حضرت آپ کے یہ علماء اور مشائخ کا گروہ جن کا کام بقول آپ کے مفسر صاحب کے یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہو۔ قرآن وحدیث کی طرف لوگوں کو بلاتا ہو"۔ ہمیشہ مسلمانوں ہی میں تبلیغ کیا کرتا ہے کیا وہ مسلمانوں ہی کو "اسلام" کی دعوت دینے اور قرآن وحدیث کی طرف بلانے کے لئے ہے؟ اور ان ہی کو "دعوت اسلام" دینے کے لئے ایک جماعت بنانے کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے۔ قرآن تو کہتا ہے کہ نہ۔

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَ — کاموں کے کرنے کو کہا کریں اور بُرے کاموں
أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ — سے روکا کریں اور ایسے لوگ پورے
(آل عمران ۱۱۰) — کامیاب ہوں گے۔"[1]

میں نے کہا: "بھلا اس آیت کے سمجھنے میں کیا تکلف اور زحمت ہے؟ صاف تو ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیک کام کی طرف دعوت دے "معروف" پر عامل اور "منکر" سے مجتنب رہنے کو کہے۔ یعنی اس سے مراد ہمارے علماء و مشائخ ہیں۔" چنانچہ میں نے ان صاحب کے مزید اطمینان کے لئے "تفسیر بیان السبحان" جلد چہارم سے، آیت زیر بحث کی یہ تفسیر اُن کو سنائی جو تمام قدیم و جدید تفاسیر کا نچوڑ اور جوہر ہے:-

"یہ گذشتہ آیت کا تکملہ ہے۔ حاصل ارشاد یہ ہے کہ مسلمانو! تم میں ایک گروہ مخصوص طور پر ایسا ہونا چاہیے جو لوگوں کو

---

[1] یہ ترجمہ اشرف علی صاحب تھانوی کا ہے محترم سید عبدالدائم جلالی "تفسیر بیان السبحان" کے نام سے ایک نئی تفسیر لکھ رہے ہیں جس کے متعلق دعویٰ ہے کہ قدیم کتب تاریخ و سیر اور احادیث و تفاسیر کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے۔ اب تک اس پارہ کی تفسیر دفتر رسالہ مولوی روہلی سے شائع ہوئی ہے وہ اس آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں:-

"تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے اور اچھے کاموں کا حکم دیتی رہے اور بُرے کاموں سے روکتی رہے اور یہی لوگ مرادوں کو پہنچنے والے ہیں۔"

پھر کیا اس جماعت کا کام یہ ہوگا کہ خود اسی جماعت کے افراد کو وہ معروف و منکر بتلائیں گے ؟ یہ کس قدر مہمل بات ہے کہ جس جماعت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ بہترین جماعت ہے اور اس کا انتخاب اس لئے عمل میں آیا ہے کہ اُن میں کی ایک جماعت لوگوں کو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کرے۔ اُسی جماعت میں کے کچھ افراد، خود اسی جماعت کے دوسرے افراد میں "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کریں ؟"

میں نے جز بز ہو کر کہا "آخر آپ کے نزدیک اس آیت کا مفہوم کیا ہے؟"

اجنبی نے کہا :-

"کرم فرما! آیت زیر بحث کی یہ تفسیر جس کتاب سے آپ نے سُنائی ہے اگرچہ وہ کتاب اسکی جلد اور تحریر کے اعتبار سے جدید ہے مگر اسکا سرمایہ فکر تمام تر قدیم تفاسیر ہی سے ماخوذ و مستعار ہے اور اس آیت کا یہ مطلب جو آپ نے بتایا اور ان مفسر صاحب نے سمجھایا ہے نہ صرف قدیم ہے بلکہ سراسر غلط بھی ہے۔ عرصے سے مسلمان اس آیت پر غور و فکر نہیں کر رہے ہیں جس وجہ سے اس کو غلط سمجھ بھی رہے ہیں اور سمجھا بھی رہے ہیں۔ آپ تمام تفاسیر کو سامنے سے ہٹا کر پشت کی طرف کر کے رکھ دیجئے۔ قرآن، احادیث و تفاسیر سے سمجھ میں نہ آئے گا کیا آپ نے علامہ آزاد کی "ترجمان القرآن" کے مقدمہ میں یہ سطریں نہیں پڑھی ہیں ؟:-

"اب اگر ہم چاہتے ہیں کہ قرآن کو اُس کی حقیقی شکل و نوعیت میں دیکھیں تو ضروری ہے کہ پہلے وہ تمام تر پردے ہٹا دیں جو مختلف عہدوں اور مختلف گوشوں کے خارجی موثرات نے اس کے چہرے پر

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۲)

"تم لوگ بھی جماعت ہو کہ وہ جماعت لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیکیوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو[1]"

ذرا سمجھائیے تو کہ اگر اس "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی تبلیغ کا کام مسلمانوں ہی میں ہونا چاہیے جیسا کہ آپ کے علماء اور مشائخ ہمیشہ کرتے آئے اور آج بھی کر رہے ہیں تو پھر اس آیت میں كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ کس کو کہا گیا ہے؟ کیا صرف علماء اور مشائخ کو؟ اور اگر یہ مسلمان ہیں تو پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ ان ہی میں کیا معنی اور اگر یہ کام غیر مسلموں میں کرنا یا ہونا چاہیئے تو پھر آپ کے یہ علماء و مشائخ مسلمانوں ہی کو کیا سمجھاتے پھرتے ہیں؟ "خیر امت" تو "مسلمانوں" ہی کو کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کا انتخاب اس لئے عمل میں آیا ہے کہ وہ لوگوں کو (یعنی ان کو جو اس خیر امت سے باہر ہیں) "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کریں۔ پھر خود مسلمانوں ہی میں "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی تبلیغ کیا معنی؟ دوسری ملتوں میں بھی جو جماعت صحیح دین پر ہے، اس کی بھی تعریف یہ کی گئی ہے کہ:-

مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ .... يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران ۱۴)

"اہل کتاب میں سے ایک جماعت وہ بھی ہے جو قائم ہیں اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں۔ ... اور نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں[2]"

---

[1] و [2] یہ ترجمے بھی تھانوی صاحب کے ہیں۔

جو مسلمانوں کی ایک جماعت کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ "اپنوں" میں کرنے کا نہیں بلکہ "غیروں" میں کرنے کا ہے۔ آپ کے علماء اور مشائخ "مسلمانوں ہی میں پند و نصیحت کرتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ وہ جماعت "غیر مسلموں کے لئے بنائی گئی ہے۔ مگر اس آیت کو سرے سے الٹا سمجھا اور سمجھایا گیا اور اس وقت مسلمانوں ہی کو "معروف" و "منکر" سمجھایا اور بتایا جا رہا ہے۔ یہ بھی غلط اور قطعاً غلط ہے کہ لوگوں کو "معروف" پر عامل اور "منکر" سے محتاط بنانے والی جماعت سے مراد واعظین و مبلغین یا علماء اور مشائخ کی جماعت ہے۔ بھلا یہ جماعت خود ہی کب "معروف" کی عامل اور "منکر" سے مجتنب ہے جو دوسروں کو متاثر کر سکے گی؟ اس جماعت کے بیشتر افراد وہ ہیں جن کے متعلق علامہ نیاز فتحپوری نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کہ:-

"سوال عام مسلمانوں کا نہیں بلکہ اُن اکابرین اسلام کا ہے جو اپنے بڑے بڑے عمامہ اور لانبی لانبی عباؤں کے ساتھ تقدس اسلامی کا قد آدم اشتہار بنے پھرتے ہیں۔ اُن علماء کرام اور صوفیائے عظام کو دیکھئے جو اپنی طویل الذیل ڈاڑھیوں اور ڈھیلے ڈھالے خرقوں کے ساتھ ہیبت اسلامی کا دیو پیکر مجسمہ نظر آتے ہیں کہ اگر کسی کسی بستی میں جو انسانی عصیاں کاری سے تباہ و برباد ہو چکی ہے۔ عدوان عصبیت کا کوئی صحیح مجسمہ نصب کیا جانا مقصود ہو تو ان سے بہتر ماڈل مل ہی نہیں سکتا۔ ان کے جسم کے ایک ایک ریشہ

ڈال دیئے ہیں۔ پھر آگے بڑھیں اور قرآن کی حقیقت خود قرآن ہی کے صفحوں میں تلاش کریں۔"

علامہ آزاد نے غلط نہیں کہا ہے کہ "قرآن" پر ہزاروں پردے پڑ گئے ہیں لہٰذا اگر "قرآن" کو سمجھنا ہے تو اُن تمام پردوں کو ہٹا دیجئے اور "قرآن" کو خود "قرآن" ہی سے عقل و فکر کی روشنی میں سمجھئے۔ آیت زیرِ بحث کو بھی جب تک خود "قرآن" ہی سے نہ سمجھئے گا ہمیشہ غلط سمجھتے رہئے گا۔ اِدھر اُدھر سے یہ آیت قیامت تک سمجھ میں نہ آئے گی جس طرح اب تک سمجھ میں نہ آئی ہے۔ آپ خود دیکھئے کہ اس خدائی وعدے کے باوجود کہ یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور علماء و مشائخ کی ساری تگ و دو کے باوصف مسلمان فلاح پانے کے عوض فلاکت و خسران میں مبتلا ہیں اور دن بہ دن زوال و پستی میں چلے جا رہے ہیں۔ جو لوگ اس آیت کو مسلمانوں سے متعلق سمجھتے ہیں وہ سرے سے غلط راستے پر ہیں۔ "مسلمان" تو کہتے ہی اسکو ہیں جو "معروف" کا عامل اور "منکر" سے مجتنب ہو۔ لہٰذا اُن ہی میں کی ایک جماعت کو جو کام بتایا گیا ہے وہ خود مسلمانوں ہی میں کرنے کا کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا تعلق تو غیر مسلموں سے ہوگا۔

كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ۔ "اور اس طرح ہم نے تم کو ایک ایسی معتدل اُمت بنایا ہے جو بنی نوع انسان کیلئے نمونہ و گواہ بنے"۔

یعنی مسلمانوں کو ایسی معتدل جماعت بنایا گیا ہے کہ وہ باقی انسانوں کیلئے نمونہ و گواہ بنیں گے۔ اب اسی جماعت میں سے کہا جاتا ہے کہ کچھ افراد ایسے ہونے چاہئیں جو لوگوں کو "معروف" کا حکم دیں گے اور "منکر" سے روک دیں گے۔ دیکھا! یہ کام

کوئی امر ایسا نہیں جو دوسروں کے لئے واجب اور ان کے
لئے غیر ضروری نہ ہو۔ ان کا خدا قہار و جبار ہے مگر دوسروں
کے لئے، ان کے لئے نہیں۔ ان کا خدا رحیم و کریم ہے
مگر صرف ان کے لئے، دوسروں کے لئے نہیں۔"

میرے بھائی! اس جماعت سے مراد علماء اور مشائخ کی جماعت نہیں بلکہ مسلمانوں کی وہ جماعت ہے جس کے ہاتھ میں اُمورِ سلطنت ہوں۔ جو جماعتِ مومنین، نظام اسلامی چلا رہی ہو جس کے تعلق حکومت الٰہیہ کا انتظام و انصرام ہو۔ اُس کو یہ فرض سپرد کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے مسلمانوں کو بطور گواہ و نمونہ پیش کر کے دُنیا والوں سے کہے کہ دیکھو یوں ہی تم بھی اپنی زندگی گذارو اور پھر وہ اُن کو "حکم" دے کہ وہ "منکر" سے بچیں اور "معروف" پر عامل ہوں۔ آپ قرآن کے الفاظ پر بھی غور نہیں کرتے "تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ" آیا ہے یعنی معروف کا "حکم دے"۔ "امر" کے معنی ہیں "حکم کرنا" اور "يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی "منکر" سے "روک دے"۔ "نہی" کے معنی ہیں "روک دینا"۔ ظاہر ہے کہ آپ "امر بالمعروف" یعنی "عمدہ باتوں کے کرنے" کا "حکم" جب ہی کسی کو دے سکتے ہیں جب کہ آپ کی پوزیشن "حکم" دینے کی ہو۔ سمجھانے بجھانے کو "امر" یعنی "حکم" نہیں کہتے۔ یہ کام لاڈ پیار سمجھانے بجھانے اور منت و سماجت سے آپ نہیں لے سکتے بلکہ "طاقت" یعنی "قانون" سے لے سکتے ہیں اور "قانون" نام ہے حکمران فرد یا جماعت کے "حکم" کا۔ اسی طرح "نہی عن المنکر" یعنی بُری باتوں کے کرنے سے کسی کو

کی پرورش، ان کے خون کے ہر ہر قطرہ کی روانی، ایک مستقل یادگار ہے اس بدباطنی و کورنفسی کی ایک طویل داستان ہے اُس مکروفریب زور و ریا کی جس کو اسلام نے بدترین لعنت قرار دے کر دنیا سے مٹانا چاہا اور اس جماعت نے بہترین ذریعۂ فلاح و کامیاب سمجھ کر اختیار کر لیا۔

ان کے سر نمازوں میں اس لئے نہیں جھکتے کہ مقصود خدا کی پرستش ہے بلکہ صرف اس لئے کہ دوسروں کے سر ان کے سامنے جھکیں۔ وہ روزے اس لئے نہیں رکھتے کہ ابنائے جنس کی عسرت و تنگدستی کا اندازہ کر کے اُن کے ساتھ ہمدردی کریں، بلکہ صرف اس لئے کہ بہتر سے بہتر غذائیں اُن کے سامنے پیش کی جائیں۔ وہ اپنے مواعظ میں بخشش و عطا کی فضیلت اس لئے بیان نہیں کرتے کہ اُس کی اہمیت کا خود انھیں بھی عملی اعتراف ہے بلکہ محض اس لئے کہ دوسرے اپنی دولت اُن کے قدموں پر ڈالدیں۔

ان خدا سے ڈرنے والوں کی اندرونی زندگی کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی شبستان عیش میں کیسی شاد کام اور عذاب الٰہی کی طرف سے کیسی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں دنیا کی کوئی معصیت ایسی نہیں جو دوسروں کے لئے حرام اور ان کے لئے حلال نہ ہو۔ اور فرائض اخلاق میں سے

نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آپ نے "امر" اور "نہی" کا ذریعہ وعظ و نصیحت اور پند و تبلیغ سمجھا ہے۔ حالانکہ "امر" و "نہی" کا پند و نصیحت سے مطلقاً کوئی سروکار نہیں ہے کسی چیز کا "حکم دینا" یا کسی چیز کی "ممانعت کرنی" صرف حاکمانہ اقتدار ہی سے ممکن ہے۔ انگریزی میں اس کو

"Enforce and Prohibit"

کہیں گے یعنی "حکم نافذ کرنا" اور "حکم سے روک دینا" اگر وعظ سے کسی "معروف کا حکم دینا" اور تبلیغ کے ذریعے "منکر سے روک دینا" کافی یا ممکن ہوتا تو آنحضرت صلعم مدینہ پہنچتے ہی اور موقع ملتے ہی حکومت و اقتدار کی بنیاد کبھی نہ رکھتے۔

اگر "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا تعلق پند و نصیحت اور تبلیغ و وعظ سے ممکن ہوتا تو "قرآن" حکومت و اقتدار کی اشد ضرورت پر ہرگز زور نہ دیتا۔ دیکھئے چونکہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو یعنی اس گروہ کو جس کے ہاتھ میں مملکت اسلامیہ کا انتظام و انصرام ہو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ بھی تاکید کی گئی ہے کہ وہ جس قدر بھی ممکن ہو طاقت بہم پہنچائے رکھیں:-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (انفال ۸) — اور جس قدر بھی تمہارے بس میں ہو، طاقت بہم پہنچائے رکھنا"

یہ آیت سورۃ "انفال" میں ہے جس کا عنوان ہی عسکریانہ ہے۔ "انفال" مال غنیمت کو کہتے ہیں جو عسکری مہم میں حاصل ہو اور دیکھئے کہ

روک دینا" اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک آپ میں روکنے کی طاقت نہ ہو۔ یعنی آپ میں اتنی طاقت نہ ہو کہ آپ کے کہنے کو جو لوگ نہ مانیں تو آپ اُن سے بزور اپنا "حکم" منوا سکیں۔ وعظ و نصیحت کے ذریعے کسی شخص کو کسی فعل سے رُک جاتے دیکھا ہے؟ یہ "روک دینے" کا کام جب ہی ممکن ہے جب کہ آپ کے ہاتھ میں حکومت و طاقت ہو۔ آپ کسی قاتل کو کسی کے قتل سے جب ہی روک سکتے اور مقتول کی جان بچا سکتے ہیں جب آپ کے بازو میں اتنی طاقت ہو کہ قاتل کے نہ ماننے پر آپ اُس کے ہاتھ سے اسلحۂ قتل چھین لے سکیں یا اس کو حکم نہ ماننے کی قرار واقعی سزا دے سکیں۔ یہ کام تدارک کی طاقت رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ وعظ و تلقین کے ذریعے نہیں۔ میں نے بھی آپ کی یہ تفسیر "بیان السبحان" پڑھی ہے۔ اسی جگہ آخر میں مفسر صاحب نے جھوٹے علما و مشائخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

"ان سے بجائے فائدے کے اسلام کو ضرر پہنچ رہا ہے انھوں نے ہی اسلام کی روح مسلمانوں کے دلوں سے نکال لی ہے اور صرف بوسیدہ مٹی کر کے چھوڑ دیا۔ خدا اس بدشعار گروہ سے مسلمانوں کو نجات عطا فرمائے۔"

غور فرمائیے کہ جب مسلسل وعظ و نصیحت اور تلقین و تبلیغ جاری ہے تو ان مبلغین و واعظین اور علما و مشائخ کی محنت کیوں اکارت جا رہی ہے؟ اور مسلمان دن بدن گرتے ہی کیوں چلے جا رہے ہیں؟ آخر کوئی فائدہ کیوں

میں ہے جس کا مطلب میں نے آپ سے پوچھا تھا، اس کو خود "قرآن" کی اس آیت کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے۔ مسلمانوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ (حج ۶)

"یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انھیں ہم ملک میں اقتدار عطا کریں گے تو یہ لوگ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ کا نظم کریں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روک دیں گے۔ اور ان کے سارے امور کے آخری فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق ہوا کرینگے"

دیکھا کہ "امر بالمعروف" کا کام کب اور کہاں ہوگا؟ غور کیا کہ "نہی عن المنکر" کن کے ہاتھوں اور کس طرح ممکن ہے؟ "قرآن" "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا جس جماعت کو حکم دیتا ہے تو وہ اُس جماعت کا پہلے "تمکین فی الارض" ہونا لازمی اور ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ حصر ہے کہ مسلمان یہ کام جب کریں گے جب کہ اُن کو ہم ملک کا حاکم بنائیں گے۔ کیونکہ جب تک حکومت و اقتدار نہ ہو یعنی جو جماعت "حکم" دے رہی ہے اُس کے ہاتھ میں حکم دینے اور منوانے کی طاقت نہ ہو لوگ اس کی بات نہ مانیں گے جب تک آپ کے ہاتھ میں طاقت نہ ہوگی لوگ آپ کا کوئی حکم ماننے پر

اس سامان قوت کی بہم رسانی کے اخراجات کو "انفاق فی سبیل اللہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ متذکرہ بالا آیت، سامان قوت بہم پہنچائے رکھنے کے حکم سے شروع ہو کر ختم ہوئی ہے اس ٹکڑے پر:-

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ	اور اس سلسلہ میں جو کچھ بھی تم فی سبیل اللہ
سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَ	خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا مل جائیگا
أَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ	اور تم پر ظلم نہ کیا جائے گا"

غور فرمایئے۔ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا کام سپرد کیا گیا تو امکان بھر سامان قوت بھی بہم پہنچائے رکھنے کا حکم دیا گیا اور اس سامان قوت کی بہم رسانی میں جو روپے خرچ ہوں گے اُن کو "انفاق فی سبیل اللہ" سے تعبیر کیا گیا اور یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ اس خرچ کا خیال نہ کرنا۔ یہ روپیہ برباد نہ جائے گا بلکہ اللہ پورا پورا وصول کرا دے گا۔ اب سوچئے کہ "امر و نہی" وعظ و نصیحت سے ممکن ہے؟ اور اگر ممکن ہے تو پھر یہ طاقت بہم پہنچائے رکھنے کا کیوں حکم دیا گیا؟ — دیکھئے میں نے جس آیت کا مطلب آپ سے دریافت کیا تھا وہ آپ نہ سمجھا سکے۔ کیونکہ آپ نے اس آیت کو پردہ ڈالنے والی کتابوں سے اور بے غور و فکر سمجھا ہے۔ اگر آپ اُس آیت کو خود "قرآن" ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے تو فوراً سمجھ جاتے دیکھئے مسلمانوں کے تعلق "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا جو فرض سپرد کیا گیا ہے اور جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی اُس آیت

جا سکتا ہے اُس پر کوئی دوسری کتاب نہیں رکھی جا سکتی۔ اللہ کی بات کو، اللہ ہی کی کتاب سمجھا سکتی ہے، دوسرا نہیں سمجھا سکتا۔ قرآنی آیات والفاظ کا مفہوم قرآنی آیات والفاظ ہی سمجھائیں گے علماء و مشائخ نہیں مگر ہاں یہ دولت بے محنت نہیں ہاتھ آئے گی۔ اسی لئے تو تاکید کی گئی ہے کہ "قرآن" برابر تلاوت کیا کرو۔ اور اس میں خوب غور و فکر کیا کرو۔

میں ششدر و حیران سر جھکائے سب کچھ بغور سُن رہا تھا۔ آنکھوں کے پردے ہٹ رہے تھے اور میں اس "اجنبی" کی عرش مقام قرآن فہمی پر رشک کر رہا تھا۔ جب آواز رُک گئی، تو نظر اٹھا کر سامنے دیکھا "اجنبی" جا چکا تھا ؎

مجبور نہ ہوں گے۔ پھر کیا یہ وعظ و تبلیغ سے ممکن ہے؟ غور کیجئے کیا اس آیت میں جس جماعت کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے، اُس سے مراد آپ کے علماء و مشائخ ہیں جیسا کہ آپ خود سمجھے ہوئے ہیں اور مجھے بھی سمجھانا چاہتے تھے؟ سُنئے! اس آیت میں "مِنْكُمْ اُمَّةٌ" سے مراد عام مسلمانوں ہی میں سے، مسلمانوں کی وہ خاص جماعت ہے جس کے ہاتھ میں ملت اسلامی نے، مملکت اسلامی کا نظم و نسق دیا ہو۔ یہ جماعت با اختیار ہوگی اور اس کا کام خود مسلمانوں ہی کو "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کا "حکم" دینا نہیں ہوگا۔ بلکہ غیر مسلموں کو، اُن کو دینا ہوگا۔ جن کا اس پر عمل نہ ہوگا۔ "مسلمان" تو اسی جماعت کو کہا ہی گیا ہے جو "معروف" کی عامل اور "منکر" سے مجتنب ہوگی۔ یہ جماعت جس کے تعلق یہ کام سپرد کیا گیا ہے۔ دنیا کو حکم دے گی کہ "معروف" پر عمل کرو اور "منکر" سے احتیاط برتو اور اُن کی اس دعوت کی پشت پر اُن کے پاس اتنی طاقت ہوگی کہ لوگوں کے نہ ماننے کی صورت میں وہ اپنا یہ حکم بزور منوا سکیں گے اور یہی لوگ جو یہ خدمت انجام دیں گے، وہ ہیں جن کو دنیا میں بھی فلاح ہوگی اور دین میں بھی۔

غور فرمایا آپ نے قرآنی آیت اور اس کے ہر ہر لفظ کو غلط معنے پہنا کر کس طرح کچھ سے کچھ کر دیا گیا ہے۔ محترم! قرآنی آیات اور الفاظ کو غور و فکر کے ساتھ خود "قرآن" ہی سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کیجئے ورنہ قیامت تک صورت حال تبدیل نہ ہوگی۔ "قرآن" پر "قرآن" ہی دھرا

قرآن کے متعلق چند کتابیں

نکاتِ قرآن جس میں قرآن کریم کے سینکڑوں نکتے بطور سوال وجواب کے لکھے گئے ہیں سوالات بھی قرآن ہی سے ہیں اور جوابات بھی قرآن ہی سے ہیں اور یہ سب سوالات سورۃ وار درج کئے گئے ہیں مصنفہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری قیمت عہ

سیرۃ قرآنیہ سیدنا محمدؐ "ترتیب نزول قرآن" کی روشنی میں پہلی سیرت نبوی ہے جس کے ساتھ ساتھ قرآن کو پڑھنے کے بعد لسانی، تاریخی اور فلسفیانہ اشکالات قطعاً دور ہو جاتی ہیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے پیام اور طریقہ کار کو سمجھنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں مصنفہ الحاج محمد اجمل خانصاحب ایم اے۔ قیمت للعہ

اعلان انقلاب۔ وحی اول کا انقلابی پیغام از محمد اجمل خانصاحب۔ قیمت عصہ

پیمان انقلاب پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں سورۃ الحمد کا انقلابی مفہوم۔ از محمد اجمل خانصاحب قیمت عصہ

مشکلات قرآن کا انقلابی حل پس منظر اسلام اور ترتیب نزول قرآن کی روشنی میں۔ از محمد اجمل خانصاحب قیمت عصہ

انوار تفکر از عطاء اللہ پالوی "سجدہ" "شجرہ" "زبور" "ذلورۃ" "محکم" "متشابہ" اور "فتنا" "القینا" کے موضوع پر پہلی بار ایک جدید اور قابل اطمینان جائزہ قرآن کی روشنی میں پیش کی گئی ہے۔ جو لائق مطالعہ بھی ہے اور قابل غور بھی۔ (زیر طبع)

ملنے کا پتہ:۔ سنگم کتاب گھر۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی